ارمغانِ دکن

بہادر یار جنگ رشید گرامی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شمارہ ھٰذا میں ۵ مضامین اور ۸ نظمیں ہیں جو عظیم
مملکت اسلامیہ آصفیہ دکن سے تعلق رکھنے والوں کا
خراج عقیدت ہے۔ جو شاعر مشرق کی صد سالہ
جشن ولادت کے موقعہ پر بہادر یار جنگ اکیڈمی کراچی
کا نذرانہ عقیدت ہے

اس کتاب کا دیباچہ قائد ملت کی تحریر بعنوان
اقبال کا پیغام آزادی صفحہ ۱۱ سے ۲۲ تک ہے

دوسرا مضمون علامہ اقبال اور بہادر یار جنگ از محمد
احمد خاں صاحب کا ہے جس میں علامہ اقبال سے
قائد ملت کے ذہنی ربط و قلبی تعلق پر سیر حاصل
بحث کی گئی ہے

تیسری نظم میں بھی حضرت قائد ملت اور علامہ اقبال
کے گہرے تعلق کا اظہار کیا گیا ہے

عبدالواحد معینی صاحب کا مضمون

حیدرآباد دکن سے علامہ اقبال کے
تعلقات میں سراکبر کے تعلق سے
علامہ اقبال کے سلسلے احبابات پیر کاملک
کے استفسار کا ذکر صفحہ ۱۹ پر ہے
صفحہ ۷۶ ، ۷۷ پر حیثیت الامت
میں درس اقبال کا ذکر ہے
اقبالیات اور حیدرآباد کے زیر عنوان
غلام محمد کے مضمون میں دو جگہ صفحہ
۱ اور ۵۵ پر ذکر موجود ہے

نذیر احمد

ارمغانِ دکن

علامہ اقبال کی خدمت میں حیدرآباد دکن
کے ادیبوں اور شعراء کا نذرانۂ عقیدت

بہادر یار جنگ اکادمی کراچی

مندرجات

مضمون	مضمون نگار	صفحہ
پیش لفظ	محمد احمد خان	۵
اقبال کا پیام آزادی	قائد ملت بہادر یار جنگ	۱۱
اقبال اور بہادر یار جنگ	محمد احمد خان	۲۳
حیدر آباد دکن سے علامہ اقبال کے تعلقات	جناب عبدالواحد معینی	۳۵
اقبالیات اور حیدر آباد	مولانا غلام محمد	۴۹
خطاب بہ تاجدار دکن	علامہ اقبال	۶۷
طلوع سحر	علامہ اقبال	۶۸
گورستان شاہی	علامہ اقبال	۷۳
امت کا شب چراغ	مخدوم محی الدین	۷۹
حضرت اقبال	سکندر علی وجد	۸۰
شاعر مشرق	صاحبزادہ میکش	۸۳
آہ اقبال	عبدالقیوم باقی	۸۴
خواب اقبال	نظر حیدر آبادی	۸۵

شاعرِ مشرق علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ

پیش لفظ

"ارمغان دکن" علامہ اقبال کی خدمت میں مرحوم مملکت اسلامیہ آصفیہ حیدرآباد دکن سے تعلق رکھنے والوں کا خراج عقیدت ہے، جو شاعر مشرق کی صد سالہ جشن ولادت کے موقع پر بہادر یار جنگ اکادمی کی طرف سے پیش کیا جارہا ہے۔ اس کی بسم اللہ قائد ملت الحاج محمد بہادر خاں (نواب بہادر یار جنگ) کی ایک یادگار تقریر سے ہورہی ہے۔ قائد ملت مرحوم نے علامہ اقبال پر بلا مبالغہ سینکڑوں تقریریں کی ہیں، اور ہر تقریر اپنی مثال آپ تھی، لیکن ہماری بدقسمتی ہے کہ خطابت کے یہ انمول جواہر پارے آج محفوظ نہیں ہیں۔ لے دے کے اس سلسلہ کی یہی ایک تقریر محفوظ رہ گئی ہے۔ یہ تقریر قائد مرحوم کی زندگی ہی میں ان کی سیاسی تقاریر کے مجموعہ میں شائع ہوئی تھی اور وہیں سے بطور تبرک یہ نقل کی گئی ہے۔ دوسرے مضمون کا عنوان "علامہ اقبال اور بہادر یار جنگ" ہے۔ اس میں علامہ اقبال سے قائد ملت مرحوم کے ذہنی روابط کو مختصراً واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ سابق مملکت اسلامیہ آصفیہ سے علامہ اقبال کے جو تعلقات رہے ہیں اس کو سید عبدالواحد صاحب معینی۔ ام۔ اے (آکسن) نے اپنے مضمون میں بیان کیا ہے۔ واحد صاحب ایک عرصہ دراز تک حیدرآباد دکن میں ناظم جنگلات (ڈائرکٹر آف فارسٹ ڈیپارٹمنٹ) رہے ہیں، پھر انہیں اقبال اور اقبالیات سے بڑا شغف رہا ہے۔ قائد ملت کی کوٹھی پر ہر ہفتہ "جو درس اقبال ہوا کرتا تھا" اسمیں موصوف

بڑی پابندی سے شرکت فرمایا کرتے تھے۔ وہ اقبال پر کئی بلند پایہ کتابوں کے مصنف بھی ہیں اور اقبال اکادمی پاکستان کے نائب صدر رہ چکے ہیں۔ جو کچھ انہوں نے اس مضمون میں بیان فرمایا ہے، وہ دلچسپ بھی ہے اور مستند بھی "اقبالیات اور حیدرآباد" مولانا غلام محمد صاحب نے تحریر فرمایا ہے۔ یوں تو اس مضمون کا ماخذ نظر حیدرآبادی کی کتاب "اقبال اور حیدرآباد" ہے تاہم اس میں مولانا موصوف نے کافی اضافہ کیا ہے۔

حصہ نظم میں ابتداءً علامہ اقبال کی تین نظمیں ہیں جن کا تعلق حیدرآباد دکن سے ہے۔ "یہ کلیات اقبال" مرتبہ عبدالرزاق صاحب راشد میں شائع ہوئی تھیں اور وہیں سے ان کا چربہ (فلم) لیا گیا ہے۔ اسکے بعد مشہور حیدرآبادی شعراء کا وہ خراج عقیدت ہے، جو حضرت علامہ کی وفات پر پیش کیا گیا تھا۔

سابق مملکت اسلامیہ آصفیہ کو علامہ اقبال سے خصوصی تعلق رہا ہے بعض امور تو ایسے ہیں کہ یہ مملکت بجا طور پر اولیت کا دعویٰ کر سکتی ہے۔ مثلاً

- علامہ اقبال کی زندگی میں سب سے پہلا یوم اقبال نہایت عظیم الشان پیمانہ پر بلدہ حیدرآباد میں منایا گیا۔ جس کے دو اجلاس ہوئے۔ پہلے اجلاس کی صدارت ولی عہد سلطنت نواب اعظم جاہ نے کی اور دوسرے اجلاس کی صدارت اس وقت کے وزیر اعظم سر مہاراجہ کشن پرشاد نے کی، جن سے علامہ اقبال کے ذاتی مراسم بھی تھے۔
- علامہ اقبال کے انتقال کے بعد قائد ملت بہادر یار جنگ نے اپنی کوٹھی پر "درس اقبال" کا سلسلہ شروع کیا۔ یہاں ہفتہ میں ایک دن کلام اقبال کا سبقاً سبقاً مطالعہ کیا جاتا تھا۔ یہ سلسلہ قائد ملت کی وفات تک جاری رہا۔

- مطالعہ اقبال کے سلسلے کی پہلی بنیادی کتاب "روح اقبال" حیدرآباد ہی میں لکھی گئی اور وہیں سے شائع ہوئی۔
- علامہ اقبال کے اردو کلام کا مجموعہ "کلیات اقبال" کے نام سے سب سے پہلے حیدرآباد ہی سے شائع ہوا۔
- علامہ اقبال کے نثری مضامین کا پہلا مجموعہ "مضامین اقبال" کے نام سے حیدرآباد ہی نے شائع کیا۔
- "بزم اقبال" بھی سب سے پہلے حیدرآباد ہی میں قائم ہوئی، جس کے صدر خانوادہ شاہی کے ایک فرزند نواب حسن یار جنگ تھے اور اس بزم نے سب سے پہلے کلام اقبال کے بعض حصوں کو مصور کروایا۔
- ان سب باتوں سے بھی بڑھ کر ایک بات اور تھی وہ یہ کہ اقبال کے متخیلہ میں "شاہین زادہ" کا جو تصور تھا، وہ بقول ڈاکٹر رضی الدین صدیقی سابق وائس چانسلر قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد قدرت نے حیدرآباد ہی میں مجسم کیا ——— یعنی قائد ملت محمد بہادر خاں (بہادر یار جنگ)!

ان باتوں کا تذکرہ میں نے بطور تفاخر نہیں، بطور امر واقعہ کیا ہے۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرحوم مملکت اسلامیہ آصفیہ کے مسلمانوں کے دل میں علامہ اقبال کا کیا مقام تھا۔ لیکن ایک بات رہی جاتی ہے کہ خود علامہ اقبال اس مملکت کو کس نظر سے دیکھتے تھے۔ وقت کی کمی کے باعث یہ پہلو تشنہ رہ گیا، اس کو بھی انشاءاللہ آئندہ کسی موقع پر پیش کیا جائے گا۔

زیر نظر کتاب کی کتابت و طباعت کے سلسلہ میں سید بنیاد علی صاحب مہتمم اکادمی کی سعی و جستجو قابل داد ہے کہ ان کے بغیر یہ کتاب مختصر مدت میں شاید شائع نہ ہو سکتی تھی۔

محمد احمد خاں
میر مجلس بہادر یار جنگ اکادمی

کراچی
۱۴ دسمبر ۱۹۷۷ء

تراجوہر ہے نوری پاک ہے تو
فروغِ دیدۂ افلاک ہے تو
ترے صیدِ زبوں افرشتہ دحور
کہ شاہینِ شہِ لولاک ہے تو

علامہ اقبالؒ

قائدِ ملّت نواب بہادر یار جنگؒ

قائد ملت نواب بہادر یار جنگ

اقبال کا پیام آزادی

خرد کی تنگ دامانی سے فریاد
تجلی کی فراوانی سے فریاد
نگہ کی نامسلمانی سے فریاد

گوارا ہے اسے نظارۂ غیر
سچا شاعر وقت کے دربار کا نقیب[1]

ہوتا ہے اور وہی باتیں اس کی زبان سے شعر کا جامہ پہن کر نکلنے لگتی ہیں۔ جو وقت کی ضرورت اور زمانہ کا تقاضا ہوتی ہیں۔ اگر اقبال انیسویں صدی میں پیدا ہونے کی بجائے پندرھویں صدی یا سولھویں صدی میں پیدا ہوتے تو شاید ان کی شاعری میں ہم کچھ اور پاتے ہماری خوش نصیبی سے وہ اس زمانہ میں پیدا ہوتے ہیں جب کہ نہ صرف ہندوستان بلکہ سارا عالم اسلام نہ صرف عالم اسلام بلکہ سارا جہان مشرق معاشی سیاسی اور ذہنی حیثیت سے مغرب کی غلامی کی لعنت میں گرفتار تھا۔ اقبال کا دل اور وہ حساس دل جس کو قدرت کا بہترین عطیہ کہنا چاہیئے، اپنے ماحول کی ان کیفیات سے تڑپ اٹھتا ہے اور وہ اپنی اس غلامی کا نوحہ پڑھنے لگتے ہیں۔

---

[1] قائد ملت نواب بہادر یار جنگ نے یہ تقریر یوم اقبال منعقدہ ۱۵ دسمبر ۱۹۴۰ء کے عظیم الشان اجتماع میں بمقام زمرد محل حیدرآباد دکن کی تھی۔

شرق و غرب آزاد و ما نخچیر غیر
خشت ما سرمایہ تعمیر غیر
زندگانی بر مراد دیگراں
جاوداں مرگ است نے خواب گراں

اصحاب استبداد کی مکر سامانی

جب وہ سیاسیات حاضرہ کی تماشہ گاہ پر نظر ڈالتے ہیں تو ان کو ہر طرف اصحاب تسلط و استبداد کی مکر سامانیوں اور فریب کاریوں سے سابقہ پڑتا ہے ان کو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ غلاموں میں کس طرح نشۂ غلامی کو تیز تر کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اور غلاموں کے قلب و دماغ کو کس طرح دیوار محبس میں آسودہ رہنے کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ وہ مرغ زیرک کی دانہ مستی پر تڑپ جاتے ہیں اور اس سیاسیات حاضرہ کے طلسم کو توڑنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اور اس کی نسبت یوں نغمہ سرا ہوتے ہیں۔

می کند بند غلاماں سخت تر — حریت می خواند او را بے بصر
در فضایش بال و پر نتواں کشود — با کلیدش ہیچ در نتواں کشود
گفت با مرغ قفس اے درد مند — آشیاں در خانہ صیاد بند
ہر کہ سازد آشیاں در دشت و مرغ — او نباشد ایمن از شاہین و چرغ
از فسونش مرغ زیرک دانہ مست — نالہا اندر گلوئے خود شکست
الحذر از گرمی گفتار او — الحذر از حرف پہلو دار او

خوئے غلامی

اقبال کو اقوام مستبد و غالب کی ان فسوں کاریوں سے زیادہ اقوام مغلوب

و محکوم کی کوتاہیوں پر غصہ آتا ہے وہ سمجھتے ہیں کہ غالب اپنی حاکمیت پر اتنا قصوروار نہیں جتنا مغلوب اپنی محکومیت کے لئے ذمہ دار ہے کہتے ہیں ؎

جاں بھی گرو غیر بدن بھی گرو غیر — افسوس کہ باقی نہ مکاں ہے نہ مکیں ہے
یورپ کی غلامی پہ رضامند ہوا تو — مجھ کو گلہ تجھ سے ہے یورپ سے نہیں ہے

انہوں نے بارہا اس بات کو ظاہر کیا کہ خواجگی کی مشکلوں کو آسان کرنے میں تمام تر مجرم غلام کی خوئے غلامی ہے۔ ؎

دورِ حاضر ہے حقیقت میں وہی عہدِ قدیم — اہلِ سجادہ ہیں یا اہلِ سیاست ہیں امام
اس میں پیری کی کرامت ہے نہ میری کا ہنر — سینکڑوں صدیوں سے خوگر ہیں غلامی کے غلام
خواجگی میں کوئی مشکل نہیں رہتی باقی — پختہ ہو جاتے ہیں جب خوئے غلامی میں غلام

انہوں نے ان صفات کو ایک ایک کر کے گنایا ہے جو قوموں میں گھن کی طرح لگتی ہیں آگ کی طرح بھڑکنے لگتی ہیں اور ان کو عضو معطل بنا دیتی ہیں۔ ان صفات کا ذکر جس درد بھرے انداز میں انہوں نے کیا ہے وہ ان کے قلب کی دردمندانہ کیفیات کا آئینہ دار ہے کہتے ہیں ؎

وائے قومے کشتۂ تدبیرِ غیر — کارِ او تخریبِ خود تعمیرِ غیر
می شود در علم و فن صاحب نظر — از وجود خود نہ گردد باخبر
نقشِ حق را از نگینِ خود سترد — در ضمیرش آرزوہا زاد و مرد
از حیا بیگانہ پیرانِ کہن — نو جواناں چو زناں مشغولِ تن
در دلِ شاں آرزوہا بے ثبات — مردہ زائید از بطونِ امہات
ہر زماں اندر تلاشِ ساز و برگ — کارِ او فکرِ معاش و ترسِ مرگ

منعماں از بخیل و عیش دوست — غافل از مغز اند و اندر بند پوست

دینِ او عہد و فا بستن بہ غیر
یعنی از خشتِ حرم تعمیر دیر

غلام قوم کے امراء

اقبال کو قوم سے زیادہ امیرانِ قوم پر غصہ ہے جو اس گلہ کے چرواہے ہیں اور اس قافلہ کے سالار اور جن کی تن پرستی اور جاہ مستی نے کم نگاہی اور کلیسا دوستی نے نوجواں سے محرومی اور لاالہ سے بدنصیبی نے قوم کو غلامی کے برُے دن دکھائے۔ ان کی نسبت کہتے ہیں ؎

داغم از رسوائی ایں کارواں — در امیرِ او ندیدم نورِ جاں
تن پرست و جاہ مست و کم نگہ — اندرونش بے نصیب از لاالٰہ
در حرم زاد و کلیسا را مرید — پردۂ ناموس مارا بر درید

غلام قوم کے دانشور

آپ کو جتنا غصہ امیروں پر ہے اتنا ہی قوم کے شعراء و حکما اور علماء پر ہے۔ جو ہمیشہ قوموں کی زندگی میں رہبر و رہنما رہے ہیں، جن کی گرمیٔ گفتار اور پختگیٔ کردار سے قوم کے لئے نشان راہ پیدا ہوتے ہیں۔ جن کے فہم صحیح اور فکر مرتب نے مشکلات کے دشت و جبل کاٹ کر منزل کے قریب ترین راستے پیدا کئے۔ اقبال کو غم ہے کہ غلام قوموں میں شعراء بھی ہوتے ہیں اور علماء و حکما بھی لیکن ان کی فکر ضمیروں کو رم آہو سکھاتی ہے۔ قوموں کو غلامی پر رضامند کرتی ہے اور جب ان کا ضمیر ان کو ملامت کرتا ہے تو ان کا دماغ ان کو تاویل کا مسئلہ سکھا دیتا ہے ؎

شاعر بھی ہیں پیدا علماء و حکماء بھی — خالی نہیں قوموں کی غلامی کا زمانہ
مقصد ہے ان اللہ کے بندوں کا مگر ایک — ہر اک ہے گو شرح معانی میں یگانہ
بہتر ہے کہ شیروں کو سکھا دیں رمِ آہو — باقی نہ رہے شیر کی شیری کا فسانہ

کرتے ہیں غلاموں کو غلامی پہ رضامند
تاویل مسائل کو بناتے ہیں بہانہ

"فلک زحل" غداران ملت

اقبال ان سب سے زیادہ ان غداران ملت کی یاد سے آتش زیر پا ہو جاتے ہیں جنہوں نے حقیر و ناقابل لحاظ قیمت پر ملت کی آزادی فروخت کر دی۔ جن کی جاہ پرستی اور خطاب دوستی نے قوموں کی زنجیر غلامی کی کڑیاں مضبوط کیں سب سے زیادہ عجیب "جاوید نامہ" کا وہ مقام ہے جہاں اقبال پیر رومیؒ کی معیت میں ہفت افلاک کی سیر کرتے ہوئے "فلک زحل" پر پہنچتے ہیں اور اس دریائے خون کو دیکھتے ہیں۔ جس کی موجیں طوفان خون اٹھا رہی ہیں جس کی فضاؤں میں طیور خوش الحان کی بجائے مار و کژدم اڑ رہے ہیں اور جن کے انتہاب میں پارہ پارہ ہائے کوہ بگھل رہے ہیں ——— ان کو حیرت ہوتی ہے کہ اس طوفانی سمندر خونیں میں ایک چھوٹی سی کشتی پر دو بدنصیب تھپیڑے کھانے دکھائی دے رہے ہیں۔ اقبالؒ ان کی مصیبت پر تڑپ اٹھتے ہیں اور پیر رومیؒ سے ان کا حال دریافت کرتے ہیں۔ پیر رومی نے بتایا کہ وہ قوم فروش غدار ہیں جنہوں نے ہندوستان کی آزادی اقوام مغرب کو بیچی اور بہت ارزاں بیچی۔ ان میں سے ایک "بنگال" کا میر جعفر اور دوسرا دکن کا "میر صادق" ہے اقبال کی آنکھوں سے حیرت و استعجاب کی کیفیت

ابھی مٹی بھی نہیں کہ ابواب فلک وا ہوتے ہیں اور اقبال ایک حسینہ کو فضائے بسیط کی پنہائیوں سے اترتا ہوا دیکھتے ہیں اس کا حسن عالم آشوب، اقبال کی آنکھوں کو خیرہ کر دیتا ہے لیکن اس کے پاؤں کی مضبوط اور وزنی زنجیریں چند بیائی ہوئی آنکھوں کو اشک آلود بنا دیتی ہیں اور اقبال کا دل تڑپ اٹھتا ہے جب وہ پیر رومیؒ سے سنتے ہیں۔ کہ یہ حسینہ روح ہندوستان ہے جس کے پاؤں میں غلامی کی مضبوط زنجیریں پڑی ہوئی ہیں۔ روح ہندوستان اپنے ایک فرزند سعید کو دیکھ کر بے اختیار و جد سرا ہوتی ہے اور اس کا نوحہ اقبال کے شاہکار جاوید نامہ کا شاہکار ہے سنئے اور ان کانوں سے سنئے جن کانوں سے اقبال نے سنا تھا۔ تڑپ جائیے اور اس طرح تڑپئے جس طرح اقبالؒ تڑپا تھا اور کوشش کیجئے کہ سرزمین ہند پھر کسی جعفر و صادق کو نہ پیدا کر سکے اور اگر پیدا ہو تو آپ کے دست و بازو اس کو قوم فروشی کا موقع نہ دے سکیں۔

شمع جاں افسرد در فانوس ہند — ہندیاں بیگانہ از ناموس ہند

مردکے نامحرم از اسرار خویش — زخمہٴ خود کم زند بر تار خویش

بند ہا بر دست و پائے من از وست — نالہ ہائے نارسائے من از وست

کے شب ہندوستاں آید بروز — مرد جعفر زندہ روح او ہنوز

تا ز قید اک بدن وامی رہد — آشیاں اندر تن دیگر نہد

گاہ او را با کلیسا ساز باز — گاہ پیش دیریاں اندر نیاز

دین او آئین او سوداگری ست — عنتری اندر لباس حیدری ست

ظاہر او از غم دیں دردمند — باطنش چو دیریاں زنار بند

جعفر اندر ہر بدن ملت کش است — ایں مسلمانے کہن ملت کش است

خندہ خنداں است و باکس یار نیست
مارا اگر خنداں شود جز مار نیست

ملتے را ہر کجا غارت گرے است
اصل او از صادقے یا جعفرے است

الاماں اے روح جعفر الاماں
الاماں از جعفران ایں زماں

غلام قوم کی عید

اس غلامی کے تصور سے اقبال پر ندامت و شرمندگی کی جو کیفیات طاری ہوتی ہیں وہی ان کے کلام اور کلام کے اثر کی روح ہیں۔ غلامی میں ساری قوم مبتلا ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ساری قوم کی شرمندگی سمٹ کر قلب اقبال میں جمع ہو گئی ہے۔ وہ اس عالم غلامی میں اپنے "قیام صلوٰۃ کو بے حضور" اپنے سجدہ کو بے سرور پاتے ہیں باوجود اس کے حق نے اپنے صد ہا جلوؤں کو ان پر بے نقاب کر دیا لیکن ان کی حق پرستی کا اعلیٰ ترین مقام یہ ہے کہ وہ قلب غلام کو جلوۂ حق کے ایک نفس کا بھی مستحق نہیں پاتے۔ ان کے نزدیک غلام جلال خداوندی اور جمال لازوالی سے بے خبر ہے اور اس سے بڑھ کر وہ غلام میں کسی لذت ایمان کی تلاش کو بے سود سمجھتے ہیں چاہے وہ حافظ قرآن ہی کیوں نہ ہو۔ ان کے نزدیک صرف عید آزادان شکوہ ملک و دین ہے اور غلاموں کی عید مومن کہلانے والوں کے ہجوم سے زیادہ کچھ نہیں ؎

از قیام بے حضور من مپرس
از سجود بے سرور من مپرس

جلوۂ حق گرچہ باشد یک نفس
قسمت مردان آزاد است و بس

مرد آزادے چو آید در سجود
در طوافش گرد او چرخ کبود

ما غلاماں از جلالش بے خبر
از جمال لازوالش بے خبر

از غلامے لذت ایماں مجو
گرچہ باشد حافظ قرآں مجو

عید آزاداں شکوہ ملک ودیں

عید محکوماں ہجوم مومنیں

اس ندامت و شرمندگی کا انتہائی مقام وہ ہے جہاں اقبالؒ حالت غلامی میں اپنی زبان سے آقائے کائنات صلعم نکالتے خجالت سے عرق عرق ہوجاتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس بندۂ خدا مست و خود آگاہ کا اسم گرامی تقدس وپاکی کا وہ نشان ہے جس کو کسی غلام کی زبان سے آلودۂ تکلم نہ ہونا چاہیئے جس کی صدائے قم نے غلاموں کی قبروں سے لاکھوں مردوں کو اٹھاکر آزادی کے تخت پر بٹھایا اقبالؒ اپنے آپ کو عالم غلامی میں اس کے نام نامی پر درود پڑھنے کے قابل بھی نہیں پاتا ہے

گرچہ دانا حال دل باکس نگفت
از تو درد خویش نتوانم نہفت

تا غلامم در غلامی زادہ ام
ز آستان کعبہ دور افتادہ ام

چوں بنام مصطفےٰ خوانم درود
از خجالت آب می گردد وجود

عشق می گوید کہ اے محکوم غیر
سینۂ تو از بتاں مانند دیر

تا نداری از محمدؐ رنگ و بو

از درود خود میالا نام او

خواجۂ افلاک اور بندۂ افلاک

اقبال نے ایک سے زیادہ مقامات پر آزاد و محکوم کا فرق واضح کیا ہے انہوں نے بتایا کہ آزاد و محکوم میں کوئی نسبت نہیں ہوتی آزاد کی رگ کی سختی مظلوم کے رگ تاک کی

طرح نرم رگ میں پیدا نہیں ہو سکتی ہے۔ ایک کا دل زندہ، پر سوز اور طربناک اور دوسرے کا دل مردہ، افسردہ اور لنومید ہوتا ہے ایک کی دولت دل روشن اور نفس گرم اور دوسرے کا سرمایہ فقط دیدۂ نمناک یہاں تک کہ ایک خواجۂ افلاک ہے اور دوسرا بندۂ افلاک اقبالؒ اپنی ملت کو پہلی صف میں دیکھنا چاہتے ہیں اور دوسری صف کو الگ کرنا چاہتے ہیں کیتنے کان ہیں جو ان کو صحیح سن رہے ہیں

آزادی کی رگ سخت ہے مانند رگ سنگ
محکوم کی رگ نرم ہے مانند رگ تاک

محکوم کا دل مردہ و افسردہ و لنومید
آزاد کا دل زندہ و پرسوز و طربناک

آزاد کی دولت دل روشن نفس گرم
محکوم کا سرمایہ فقط دیدۂ نمناک

محکوم ہے بیگانۂ اخلاص و مروت
ہر چند کہ منطق کی دلیلوں میں ہے چالاک

ممکن نہیں محکوم ہو آزاد کا ہم دوش
وہ بندۂ افلاک ہے یہ خواجۂ افلاک

پیشہ روبہی

اس فرق کو نمایاں کرنے کے بعد انہوں نے کبھی دنیا کی ہر مشہور محکوم قوم کو اور کبھی ان میں سے ہر ایک کو جدا جدا مخاطب کیا ہے اور درس آزادی دیا ہے۔ وہ کبھی اقوام مغرب کی طرف پلٹ کر کہتے ہیں کہ جلوہ کے رنگ رنگ سے باہر نکلیں اور ترک فرنگ کے ذریعے اپنی خودی کو پہچانیں۔ ان کو سکھاتے ہیں کہ "مکر غزیاں سے واقف ہو جانے کے بعد "پیشۂ روباہی" سے کام نہیں چلتا اس میدان میں شیر ہی جم سکتے ہیں اور صرف شیر اور پھر شیر و روباہ کی تمیز یوں سکھائی کہ ایک کی تلاش صرف آزادی یا موت کی منزل سے آگے نہیں بڑھتی۔

گر زمکر غوبیاں باشی خبیر — روبہی بگذر و شیری پیشہ گیر
چیست روباہی تلاش ساز و برگ — شیر مولا جوید آزادی و مرگ

غلامی سے نجات کا نسخہ !

وہ کبھی فلسطین کے عربوں کی طرف مڑتے ہیں اوران کو سمجھاتے ہیں کہ تیرے وجود میں اب بھی وہ آگ چھپی ہوئی ہے جس کے سوز سے زمانہ فارغ نہیں ہوا انکی رہبری کرتے ہیں کہ تمہاری دوا جنیوا یا لندن میں نہیں کیونکہ فرنگ کی جان تو یہود کے پنجہ میں پھنسی ہوئی ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے غلام قوموں کی نجات کا صرف ایک ہی نسخہ تلاش کیا ہے اور وہ ان قوموں میں خودی کی بیداری اور لذت نمود ہے ۔ انہی کے زبان سے سنئے ۔

زمانہ اب بھی نہیں جس کے سوز سے فارغ — میں جانتا ہوں وہ آتش ترے وجود میں ہے
تیری دوا جنیوا میں ہے نہ لندن میں — فرنگ کی رگِ جاں پنجہ یہود میں ہے
سنا ہے میں نے غلامی سے امتوں کی نجات — خودی کی پرورش و لذت نمود میں ہے

دربدن باز آفریں روحِ عمر

ان کو ہم حجازی عربوں سے مخاطب پاتے ہیں وہ انہیں روح پاک مصطفےٰ کا واسطہ دیتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ تمہاری بداعمالیوں نے اس روح مقدس کو تڑپا رکھا ہے انہیں کی شان میں ایک جگہ کہتے ہیں ؎

لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیل ؑ
خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز

کبھی کبھی زندگی کا گر یوں سکھاتے ہیں۔

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب — اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی

کبھی ان سے کہتے ہیں کہ جس نے اپنے آپ کو خودی کے بندھنوں سے چھڑایا اور بیگانوں کے ساتھ پیوست کیا وہ مر گئے اور اگر زندگی چاہتے ہو تو افسون فرنگی کو پہچانو اور اس کے فنون کو آستینوں میں چھپا ہوا دیکھنے کی کوشش کرو اس کا علاج ایک اور صرف ایک ہے تمہارے جسم روح عمرؓ سے معمور ہو جائیں ؎

ہر کہ از بند خودی وارست مرد | ہر کہ با بیگانگاں پیوست مرد
آنچہ تو با خویش کردی کس نکرد | روح پاک مصطفےؐ آمد بہ درد
اے ز افسون فرنگی بے خبر | فتنہ ہا در آستین او نگر
از فریب او اگر خواہی اماں | اشترانش را ز حوض خود براں
عصر خود را بنگر اے صاحب نظر | در بدن باز آفریں روح عمرؓ

اقبال نے بعض مقامات پر اپنے آپ کو پوری طرح عیاں کر دیا ہے۔ خصوصاً ان کا آخری چھوٹا سا رسالہ۔

ملت از جمعیت است

"پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق" ان کے لیے پردہ دلبے پنہاں تعلیمات کا حامل ہے۔ اس میں انہوں نے آزادی حاصل کرنے کے جو گر سکھائے اور قوموں کو جس طرح پیغام آزادی دیا ہے اس کا نچوڑ شاید آپ کو ان چند شعروں میں ملے۔ میں ان کی تشریح نہ کروں گا۔ عرب کا مشہور مقولہ ہے۔ "الکنایۃ ابلغ من الصراحۃ" سمجھنے کی کوشش کیجئے کہ جو نہیں سمجھتا وہ نہیں اٹھتا، جو نہیں اٹھتا وہ نہیں چلتا اور جس کے پاؤں آشنائے راہ نہ ہوں وہ ہمیشہ بیگانہ منزل رہتا ہے ؎

اے اسیرِ رنگ پاک از رنگ شو — مومنِ خود کافرِ افرنگ شو
رشتۂ سود و زیاں در دستِ تست — آبروئے خاوراں در دستِ تست
ایں کہن اقوام را شیرازہ بند — رایتِ صدق و صفا را کن بلند
اے امینِ دولتِ تہذیب و دیں — آں یدِ بیضا برآرا ز آستیں
خیز و از کارِ اُمم بکشا گرہ — نشۂ افرنگ را از سر بنہ
دانی از افرنگ و از کارِ فرنگ — تا کجا در قیدِ زنّارِ فرنگ
زخم از و نشتر از و سوزن از و — ما و جوئے خوں و امیدِ رفو
دینِ حق را زندگی از قوت است — قوتِ ہر ملت از جمعیت است
رائے بے قوت ہمہ مکر و فسوں — قوتِ بے رائے جہل است و جنوں

پیامِ اقبالؒ: انسانیت کی آزادی

اقبالؒ نے جو درسِ خودی دنیا کو دیا اور جو اس کے پیام کی اصل اور اسکی شاعرانہ اور حکیمانہ زندگی کی روح تصوّر کی جاتی ہے، اقبال فہم مجھے معاف کریں اگر میں کہوں کہ وہ اصل نہیں ذریعہ ہے اقبال کا پیام ہو کہ مرکزیت یا اقبال کی تعلیم وتمدن ہو کہ حاکمیت میں ان سب کو روحِ انسانیت کی آزادی کا ذریعہ اور آزادیِ انسانیت کو اقبال کا اصلی پیام سمجھتا ہوں۔ اگر آپ اقبال سے خود پوچھیں کہ خودی کی بیداری کا فائدہ؟ مرکزیت کا نتیجہ؟ وحدتِ قوم و ملت کا مآل؟

"بہ مصطفےٰ رسانیدن" اور "از بولہبی ترسیدن" کیوں؟ تو اقبالؒ کہتے اور آج بھی سننے والوں کو روحِ اقبالؒ جواب دے رہی ہے کہ یہ سب اس لئے کہ انسان اپنا مقام اصلی پہچانے اور غیر اللہ کے تسلط و استبداد سے نکل کر حریت کاملہ کا تاج پہنے اور آزادی کے تخت پر جلوہ فرما ہو جائے۔

محمد احمد خاں

علامہ اقبال اور بہادر یار جنگ

مولانا روم سے جو نسبت اقبال کو تھی، وہی تعلق اقبال سے بہادر یار جنگ کو رہا۔ وہ پیر یہ مرید، وہ شہباز یہ شاہین! خود بہادر یار جنگ کہا کرتے تھے "کسی کا رہنما کوئی اور ہو تو ہو، میرا رہنما اقبال ہے"!!

شاعری اور خطابت، اظہار خیال کے دو موثر ترین ذرائع ہیں۔ عربوں کو تو ان پر اتنا ناز بلکہ غرہ تھا کہ وہ اپنے آپ کو عرب (صاحب زبان) اور دوسروں کو عجم (بے زبان) کہا کرتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کی شاعری اور خطابت نے بڑے بڑے ہنگامے برپا کئے، بہت سے معرکے سر کئے بلکہ تاریخ بنائی ہے۔ اردو زبان خوش نصیب ہے کہ اس کو اقبال جیسا شاعر اور بہادر یار جنگ جیسا خطیب نصیب ہوا۔ اُن کی شاعری اور ان کی خطابت نے اردو کو دوسری زبانوں سے آنکھ ملانے کے قابل بنا دیا! ——— اقبال کی زبان سے کلام موزوں نکلتا تو شعر کا قالب اختیار کر لیتا، اور ذہن کو مسخر اور قلب کو مسحور کر دیتا۔ بہادر یار جنگ تقریر کرتے یا گفتگو تو ان کے منہ سے پھول جھڑتے اور پھول کی ان پتیوں سے ہیروں کے جگر کٹ کٹ جاتے تھے! ان پھولوں میں رنگ و نکہت اقبال کے اشعار آبدار ہی کی ہوتی تھی!! سچ ہے اِنّ مِنَ البیان لسحرا۔ وہ شاعر بے بدل، یہ خطیب بے مثل!

بہادر یار جنگ اپنی تقریروں میں سب سے زیادہ اقبال کے اشعار استعمال کیا کرتے تھے، اور یہ استعمال ایسا برجستہ اور اتنا برمحل ہوتا تھا کہ گویا اقبال نے اسی موقع کے لئے یہ اشعار کہے تھے۔ اشعار ہی نہیں اقبال کی اصطلاحیں، تلمیحیں، محاورے اور ترکیبیں وہ اپنی تقریر اور گفتگو میں نہایت بے تکلفی سے استعمال کیا کرتے تھے۔ بعض دفعہ تو انہوں نے پوری کی پوری تقریر اقبالی زبان میں کی ہے۔ اقبال کی زندگی میں سب سے پہلا یوم اقبال ان کی اور ڈاکٹر لطیف کی تحریک پر حیدرآباد دکن کے ٹاؤن ہال میں منایا گیا۔ اس جلسہ میں وہ شاہینی انداز سے شریک ہوئے تھے۔ راجستانی شملہ، حیدرآبادی چست شیروانی اور چوڑی دار پاجامہ میں وہ اتنے باوقار نظر آرہے تھے کہ،

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا این جاست

اپنے ساتھ وہ اقبال کی تمام مطبوعات لے آئے تھے اور تقریر شروع کرنے سے پہلے، انہوں نے یہ ساری کتابیں صدر کی میز پر ڈھیر کردی تھیں۔ سننے والوں نے سمجھا کہ دوران تقریر وہ ان کتابوں میں سے منتخب اشعار پڑھ کر سنائیں گے تقریر شروع ہوئی، تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ اقبالی زبان میں جاری رہی۔ لیکن انہوں نے کسی کتاب کو چھوا تک نہیں۔ یہ نہیں کہ ان کی تقریر اقبال کے اشعار سے خالی تھی، ویسے بھی ان کی کوئی تقریر اقبال کے اشعار سے خالی نہیں ہوا کرتی تھی، پھر یہ تو یوم اقبال کا جلسہ تھا۔ تقریر کے دوران انہوں نے کئی اشعار سنائے یہ انہیں زبانی یاد تھے۔ اس طرح اقبال کے سینکڑوں اشعار ان کی نوک زبان تھے۔ پھر ان اشعار کو وہ جس انداز سے پڑھتے تھے وہ انہیں کا حصہ تھا۔ بعض الفاظ پر زور اور بعض کو نہایت

سبک انداز میں ادائی، پھر ان کی شیریں، مگر گرجدار آواز کا زیر و بم، یہ سب مل ملا کر سامعین کے دلوں پر ایک خاص اثر چھوڑ جاتے تھے۔ جن لوگوں نے ان کی زبان سے اقبال کے اشعار سنے ہیں، ان کا تاثر آج تک محو نہیں ہوا ہے۔

وہ اقبال کی زبان اور کلام ہی سے نہیں، اس کی فکر اور پیام سے بھی بے حد متاثر تھے، بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ اقبال کی فکر اور پیام ہی نے انہیں اقبال کی زبان اور کلام ہی کا نہیں، اقبال کی شخصیت کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ اس گرویدگی کا عالم یہ تھا کہ جب کبھی ان کے سامنے اقبال کا نام لیا جاتا یا کوئی شعر پڑھا جاتا تو دیکھنے والوں کو ایسا محسوس ہوتا کہ گویا کوئی بیٹھا، ان کے تلب کو گدگدا رہا ہے یا کسی نے ان کے دل کے تاروں کو چھیڑ دیا ہے! انہیں اقبال اور اقبال کے کلام و پیام سے محبت ہی نہیں عشق تھا۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ اقبال کا کوئی ایک شعر، اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے سفر اور حضر میں ان پر کئی کئی دن تک طاری رہتا۔ اقبال کے اشعار کو سبھی پڑھتے اور ان پر سر دھنتے رہے ہیں، لیکن اقبال کے کلام و پیام کا ایسا شیدائی شاید ہی کوئی دوسرا ہوگا!

اقبال کے کلام و پیام سے والہانہ لگاؤ ہی کا یہ اثر تھا کہ انہوں نے اپنی کوٹھی پر ہفتہ میں ایک دن "درس اقبال" کا سلسلہ شروع کیا جو بالالتزام ان کی وفات تک جاری رہا۔ "درس اقبال" سے یہ نہ سمجھا جائے کہ وہ خود درس دیتے تھے۔ نہیں اس محفل درس کے معلمین تھے ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، ڈاکٹر یوسف حسین خاں اور پروفیسر غلام دستگیر رشید اور متعلمین تھے بلدۂ حیدرآباد کے معززین، اور جامعۂ عثمانیہ کے طلباء۔ اس محفل درس میں اقبال کا کلام سبقاً سبقاً پڑھا جاتا تھا۔ پروفیسر

رشید اشعار کے لغوی و لفظی معنے بیان کرتے، ڈاکٹر رضی اور ڈاکٹر یوسف ان کے مطالب کی توضیح کرتے۔ پھر زبان و بیان پر رد و قدح ہوتی اور اقبال کے فلسفہ و پیام کی تشریح کی جاتی ——— اور سب کے آخر میں بہادر یار جنگ بولتے اور جب بولتے تو دل یہ کہتا کہ ع وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔ اقبال کا ذکر اور بہادر یار جنگ کا بیان! ایک سماں بندھ جاتا تھا۔ ایک سحر تھا کہ اس وقت بھی نہ ٹوٹتا، جب یہ محفل برخاست ہو جاتی!! افسوس کہ اس زمانہ میں ٹیپ ریکارڈ ایجاد نہ ہوا تھا۔ اگر ہوا ہوتا اور ان جواہر پاروں کو محفوظ کر لیا جاتا تو اقبالیات کا انمول خزانہ آج بھی ملت کی تحویل میں ہوتا۔ ان مجالس میں 'اسرار خودی'، 'رموز بے خودی'، 'پیام مشرق' 'جاوید نامہ' کے ایک ایک شعر کا مطالعہ ہوا۔ آخری درس 'اقبال کی مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" کی نظم "در حکمت کلیمی" کا ہو رہا تھا کہ آں قدح بشکست و آں ساقی نماند۔

علامہ اقبال کے کلام و پیام کے وہ عنوانِ شباب ہی سے عاشق زار تھے اور اسی عشق کے باعث ان کے دل میں علامہ سے ملاقات کا اشتیاق پیدا ہوا۔ ملاقات کا یہ واقعہ بھی بڑا دلچسپ ہے۔ ۱۹۳۱ء میں انہوں نے فریضۂ حج ادا کیا، پھر بلاد اسلامیہ کی سیاحت کرتے ہوئے وہ واپس دہلی آئے وہاں سے لاہور پہنچے اور علامہ اقبال سے ملاقات کی۔ میری یادداشت کے مطابق یہ ملاقات غالباً جنوری ۱۹۳۲ء میں ہوئی۔ اس ملاقات کی تین باتیں بڑی دلچسپ ہیں۔ ایک تو یہ کہ ملاقات سے قبل وہ علامہ کے خادم خاص علی بخش سے ملے اور اس سے یہ فرمائش کی کہ وہ علامہ کو فکرِ سخن کرتے دیکھنا چاہتے ہیں اور اس طرح دیکھنا چاہتے ہیں کہ خود علامہ کو اس کی مطلق خبر نہ ہو۔ علی بخش نے ان سے کہا کہ وہ دوسرے دن علی الصبح، بعد نماز فجر آجائیں

کہ یہی وقت علامہ کے فکر شعر کا ہوتا ہے دوسرے دن جب بہادر یار جنگ حضرت علامہ کی کوٹھی پر پہنچے تو علی بخش نے انہیں چارپائی پر ایسی جگہ بٹھادیا، جہاں سے وہ اقبال کو فکر سخن کرتے دیکھ سکتے اور شعر گنگناتے سن سکتے تھے، لیکن اقبال کی نظر ان پر نہ پڑ سکتی تھی۔ کیسی عجیب و غریب خواہش تھی یہ! کلام اقبال کا مطالعہ کرنے والوں میں ایسا کون ہوگا، جس کو ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا اشتیاق نہ رہا ہو۔ ان کی مجلسوں میں شریک ہونے والوں میں سے اکثر و بیشتر کے تاثرات شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کی خواہش یہ رہی کہ وہ علامہ سے مختلف مسائل پر گفتگو اور ان کے ارشادات سے حسب مقدور استفادہ کرے لیکن شاید ہی ایسا کوئی ہوگا، جس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی ہو کہ وہ اقبال کو اس حالت میں دیکھے جب کہ ان پر اشعار وارد ہو رہے ہوں! بہادر یار جنگ نے علامہ اقبال کو اس حالت استغراق میں چپکے سے دیکھ ہی لیا۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ اس کے بعد انہوں نے علامہ سے یہ تعین وقت ملاقات کی۔ اس ملاقات کی بہادر یار جنگ نے تفصیلات تو نہیں بتائیں البتہ اتنا ضرور کہا تھا کہ حضرت علامہ نے حیدر آباد کے اس وقت کے وزیر اعظم سر اکبر حیدری کی شکایت کی تھی یہ شکایت ذاتی نہیں تھی علامہ نے بہادر یار جنگ کو یہ بتایا کہ لندن کی گول میز کانفرنس میں مملکت حیدر آباد کے تعلق سے سر اکبر کا رول نہایت نامناسب تھا انہوں نے فرمایا کہ حیدر آباد

کو ایک خود مختار ڈومینین کی حیثیت دینے کے مسئلے پر میں نے برطانوی حکومت کے بعض اکابرین سے تبادلہ خیال کیا اور انھیں ہموار بھی کر لیا تھا، لیکن سر اکبر نے بحیثیت نمائندہ حیدر آباد، اس سلسلہ میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ واضح رہے یہ دوسری گول

مئیر کانفرنس تھی، جس میں علامہ اقبال نے شرکت کی تھی۔ اس کانفرنس میں کل ہند،
وفاق کی اسکیم پیش کی گئی تھی اور اس میں حیدرآباد کی شرکت کا مسئلہ اٹھایا گیا تھا۔
تیسری اہم بات اس ملاقات کی یہ تھی کہ جب بہادر یار جنگ رخصت ہونے کے لئے
اٹھ کھڑے ہوئے اور علامہ سے مصافحہ کے لئے انہوں نے ہاتھ بڑھایا تو اقبال نے
ان کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں مضبوطی سے تھام لیا اور فرمایا "وعدہ کرو کہ ملت کی
خدمت کے لئے اپنے آپ کو وقف کردو گے" آپ اس کو مصافحہ رخصتی کہئے یا عہدِ
خدمت، میں تو اس کو بیعت کہتا ہوں، بیعت جو ایک پیر مرد نے ایک جوانِ رعنا
سے لی! اور بیعت بھی کس بات پر؟ اس بات پر کہ وہ ملت اسلامیہ کی خدمت کے
لئے اپنے آپ کو وقف کردے گا۔ گویا شیخ وقت نے سالکِ طریقت کو رسم و راہِ
منزل سے باخبر کر دیا! خیال رہے کہ اس وقت حضرت علامہ ساٹھ برس کے پیٹے میں
تھے اور بہادر یار جنگ ۲۵، ۳۶ سال کے کڑیل جوان! دنیا جانتی ہے کہ اس بہادر
جوان نے اپنی عمر کے بقیہ شب و روز کس طرح گذارے۔ محبوب نگر، نلگنڈہ اور ورنگل
کی تپتی ہوئی دھوپ میں سنگلاخ میدانوں کو عبور کرکے قریہ قریہ اسلام کا پیغام اس نے
پہنچایا اور بائیس ہزار گم کردہ راہوں کو سیدھا راستہ دکھایا۔ مجالس میلاد کو اپنے سوزِ
دروں سے گرمایا اور نیند کے ماتوں کو خوابِ غفلت سے جگایا اور انہیں نبی کے اسوہ
پر چلنے اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑنے کی تلقین کی۔ ۳۸ء میں مملکتِ اسلامیہ
آصفیہ کے خلاف جب ہندو کانگریس نے صف آرائی کی تو مجلس اتحاد المسلمین کے
ذریعہ اس نے ایک مضبوط حصار باندھ دیا۔ اور جب ۱۹۴۰ء میں پاکستان کی
تحریک شروع ہوئی تو شاعرِ اعظم کے خواب کو آشنائے تعبیر کرنے کے لئے اس نے

اپنی تمام صلاحیتوں کو وقف کر دیا۔ لاہور، مدراس، الٰہ آباد، دہلی اور پھر کراچی، شمال جنوب، مشرق مغرب، سب اس کے نعرۂ پاکستان زندہ باد سے گونج اٹھے!! یوں ایک مرید نے اپنے پیر کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر جو وعدہ کیا تھا، اس کو پورا کر دکھایا!

میرا قیاس ہے کہ اس ملاقات میں علامہ نے برصغیر کی سیاست کے متعلق بھی اپنے نقطہ نظر کو واضح کیا ہوگا۔ دسمبر ۱۹۳۰ء میں انہوں نے برصغیر میں ایک علیحدہ مسلم مملکت کے قیام کی تجویز پیش کی تھی۔ دوسری گول میز منعقدہ لندن میں انہوں نے کل ہند وفاق کی مخالفت کی تھی اور اسی کانفرنس میں ہندو مسلم اتحاد سے متعلق گاندھی جی نے بحیثیت واحد نمائندہ کانگریس، جو رویہ اختیار کیا تھا، اس سے وہ سخت دل برداشتہ ہو گئے تھے۔ دسمبر ۱۹۳۱ء میں وہ کانفرنس سے واپس لاہور لوٹے تھے۔ اور جنوری ۱۹۳۲ء میں بہادر یار جنگ نے ان سے ملاقات کی تھی۔ اسی ملاقات میں وفاقی اسکیم کے تعلق سے حیدر آباد کا مسئلہ جب زیر بحث آیا تھا اور مسائل حاضرہ پر گفتگو بھی ہوئی تھی تو گمانِ غالب یہ ہے کہ علامہ نے اپنی اسکیم ـــــ پاکستان ـــــ کو بھی ان سے بیان کیا ہوگا۔ اس قیاس کو بہادر یار جنگ کی ایک تحریر سے تقویت ملتی ہے۔ علامہ سے ملاقات کے دو سال بعد، یعنی فروری ۱۹۳۴ء میں وہ قائد اعظم محمد علی جناح سے بمبئی میں پہلی مرتبہ ملے تھے۔ یہ زمانہ وہ تھا، جب قائد اعظم قیام لندن کو ترک کر کے ہندوستان واپس آ چکے تھے اور سیاست میں دوبارہ حصہ لینے لگے تھے، لیکن کانگریس اور گاندھی جی کی ہٹ دھرمی کے باوجود ہندو مسلم اتحاد سے مایوس نہیں ہوئے تھے۔ بہادر یار جنگ نے قائد اعظم سے اپنی اس ملاقات کی روئیداد بیان کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"مسٹر جناح ابھی تک ہندوستان میں انگلستانی پارلیمانی جمہوریت کے تجربہ پر مصر تھے۔ جداگانہ انتخاب کے قائل ہو چکے تھے، لیکن اقبال کے تصور قومیت کو، اس کی بنیاد پر ہندوستان کے شمال مغربی گوشے میں اسلامی سلطنت کے قیام کو ایک ناقابل عمل لیکن خوش آیند نظریہ تصور کرتے تھے اور مسز سروجنی نائیڈو کے الفاظ میں ابھی تک پیامبر ہندو مسلم اتحاد بنے ہوئے تھے۔ مجھ اقبال کے حلقہ بگوش کو ان کی سیاست اپنی طرف زیادہ مائل نہ کر سکی"

(مکاتیب بہادر یار جنگ ص ۵۱۱)

یوں وہ ۳۴ء میں بھی اپنے آپ کو اقبال کا حلقہ بگوش اور ان کے سیاسی نظریہ کا قائل اور حامی بتاتے ہیں، حالانکہ اس دوران علامہ کے اس نظریہ کا کچھ زیادہ چرچا نہیں ہوا تھا اور اگر کچھ ہوا بھی تھا تو وہ مخالفانہ پروپیگنڈہ تھا۔ اس حمایت کی وجہ سوائے اس کے کیا ہو سکتی ہے کہ وہ ۳۲ء ہی میں تصور پاکستان کے خالق کی زبانی اس نظریہ سے نہ صرف آگاہی حاصل کر چکے تھے بلکہ اس کے قائل بھی ہو چکے تھے!

بہادر یار جنگ نے اپنی وفات سے چند ماہ قبل علامہ سے متعلق ایک واقعہ کا ذکر، بڑے رقت انگیز پیرایہ میں کیا تھا: فرمایا علامہ کی وفات ہو گئی تو انکی میت دیدار عام کے لئے کوٹھی کے صحن میں رکھی گئی۔ لوگ آتے تھے اور دیدار کر کے چلے جایا کرتے تھے۔ مجمع عام میں سے ایک شخص، قلندرانہ وضع میں اچانک برآمد ہوا، میت کے قریب گیا، منہ سے کفن سرکایا، چہرہ پر ایک نظر ڈالی اور بآواز بلند یہ شعر پڑھا۔

بس اتنی سی حقیقت تھی فریب خواب ہستی کی
کہ آنکھیں بند ہوا، اور آدمی افسانہ ہو جائے

بھرے مجمع میں غائب ہوگیا ۔ اس واقعہ کو انہوں نے اپنی وفات سے کچھ عرصہ پیشتر کئی آدمیوں کے سامنے بار بار دھرایا تھا! کیا معلوم کہ انہیں اسی زمانہ میں فریبِ خوابِ ہستی کی حقیقت سے کسی نے آگاہ کر دیا ہو!

اب خود اس عاشقِ اقبال کی وفات کا واقعہ سن لیجئے ۔ ۲۵ جون ۴۴ء کو اتوار کا دن تھا' اسی دن حسبِ معمول عصر اور مغرب کے درمیان ان کی کوٹھی پر درسِ اقبال کی محفل آراستہ ہوئی' معلمین اور متعلمین جمع تھے اور وہ خود رونقِ محفل بنے ہوئے تھے ۔ مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق" زیرِ مطالعہ تھی ۔ حکمتِ کلیمی والی نظم کا درس شروع ہوا ۔ پروفیسر رشید نے ترجمہ کیا' معانی و مطالب بیان کیے ۔ دیگر اساتذہ نے بھی تشریح و توضیح کی' خود بہادر یار جنگ نے اپنے در ہائے بے بہا لٹائے ۔ ایک شعر کے بعد دوسرا شعر پڑھا جاتا رہا یہاں تک کہ پروفیسر رشید نے یہ شعر پڑھا ۔

مردِ حق! افسونِ ایں دیرِ کہن　　　از دو حرفِ ربی الاعلیٰ شکن

پھر اس کے معنی و مطالب کو بیان کیا اور آگے بڑھنا چاہتے تھے کہ بہادر یار جنگ نے انہیں روک دیا ۔ کہنے لگے "رشید صاحب! بس یہاں ٹھہر جائیے یہ مقام یوں ہی گذر جانے کا نہیں ہے!" ـــــ اور محفل برخاست ہوگئی ۔ انہوں نے نمازِ مغرب باجماعت ادا کی اور معاً بعد اپنے ایک دوست ہاشم علی خاں کے گھر روانہ ہوگئے' جہاں چند مخصوص احباب کی دعوت تھی ۔ اس دعوت میں بھی "درسِ اقبال" کے ایک استاد ڈاکٹر رضی الدین صدیقی موجود تھے ۔ ان ہی کے برابر والی کرسی پر وہ بیٹھ گئے ۔ درسِ اقبال سے اٹھ کر ہی تو وہ آئے تھے' لہٰذا زبان پر وہی شعر　مردِ حق! افسونِ ایں دیرِ کہن
از دو حرفِ ربی الاعلیٰ شکن

جارہی تھا۔ گفتگو کا موضوع اقبال، کلام اقبال، فکر اقبال اور یہ شعر اقبال بن گیا۔ دیر تک متاعِ اقبال کو وہ تن آسانوں میں لٹاتے رہے۔ اسی دوران حقہ سامنے آیا۔ انہوں نے ایک کش لیا اور دیر کہن کے افسوں کو ایک ہی جھٹکے میں توڑ کر، نوائے سوختہ در گلو اپنے رب اعلیٰ سے جا ملے! "حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں"، اقبال کا یہ مصرع، رحلت سے ایک ہفتہ قبل ان پر طاری تھا۔ وہ اس کو بار بار دہرایا کرتے تھے اس دنیا سے عقبیٰ کا سفر، عقبیٰ سے ملاءِ اعلیٰ کا سفر، پھر سفر ہی سفر! یہی ذوق سفر تو حقیقی زندگی ہے۔ کیا تعجب کہ اسی حیات دوام اور سفر مدام کے تمام مناظر، اسی زمانہ میں انہیں دکھائے گئے ہوں اور اس کی تمام منزلیں ان پر آسان کر دی گئی ہوں!!

دنیا میں آج تک جتنے علوم و فنون رائج ہوئے ہیں۔ ان کی چھان پھٹک، تنقید و تحلیل ہوتی رہی ہے اور ہونا بھی چاہیئے کہ اس کے بغیر آگے بڑھنے کا راستہ نہیں ملتا۔ شاعری بھی ایک فن ہے۔ گو اس کا شمار فنون لطیفہ میں کیا جاتا ہے، تاہم اس کو بھی تنقید کی بھٹی میں تپایا جاتا رہا ہے اور نقادان سخن نے یہ بھی کچھ اس طرح سلگائی ہے کہ اس کی آگ سے کوئی شاعر نہ بچ سکا۔ یہ درست کہ نقاد کا اپنا ایک مقام ہے اور تنقید اس کا فرضِ منصبی، لیکن تنقید، بہر حال تنقید ہے، جراحی نہیں! نقاد کا قلم جب جراح کا نشتر بن جائے تو تنقید سے پوسٹ مارٹم کی بو آنے لگتی ہے اور یہ حادثہ اس صورت میں رونما ہوتا ہے، جب ناقد، سخن شناسی کو اپنا پیشہ بنا لیتا ہے۔ نقد سخن کے لئے محض سخن شناسی کافی نہیں، شاعر کے ساتھ اور خصوصاً ہر بڑے شاعر کے ساتھ انصاف تو اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب نقاد، سخن شناس ہی نہیں سخن فہم بھی ہو۔ سخنوری اگر مشکل ہے تو سخن فہمی بھی کچھ آسان کام نہیں! شاعر

اور سخن فہم کے درمیان ایک غیر مرئی رشتہ ہوتا ہے۔ جیا شاعر حامل وجدان ہوتا ہے تو حقیقی سخن فہم اس وجدان کا خوشہ چین! ایک معنیٰ میں دونوں وجدان کے حصہ دار! اسی لئے نقدِ سخن آسان سخن شناسی آسان تر مگر سخن فہمی اور سخنوری کارے دارد!! بہادر یار جنگ سخن شناس یا ناقد تو نہیں، البتہ سخن فہم ضرور تھے ان کی سخن فہمی کا کا اعتراف عہد حاضر کے ایک دوسرے بڑے شاعر جگر مرادآبادی نے اس طرح کیا کہ اپنے آخری مجموعہ کلام "آتشِ گل" کا انتساب بہادر یار جنگ کے نام کرتے ہوئے لکھا۔

"وہ بہ یک وقت تمام محاسن شعری کا احاطہ کر لیتے تھے اور اچھے شعر سے اتنی شدت کے ساتھ متاثر ہوتے تھے کہ میں نے اپنی پوری زندگی میں ایسا کوئی دوسرا خوش مذاق نہیں دیکھا"

اقبال کو بہادر یار جنگ نے نہ صرف غور و تعمق سے پڑھا اور سمجھا تھا بلکہ سمجھنے کا حق ادا کیا تھا، اسی لئے میں انہیں "اقبال فہم" کہتا ہوں۔ اقبال کی زندگی میں اقبال کے تصور مومن پر جب انہوں نے تقریر کی تو اقبال نے اس کی داد دی تھی۔ یہ انکے "اقبال فہم" ہونے پر خود اقبال کی طرف سے سند تصدیق تھی! اس "اقبال فہمی" کی بنیاد وہی غیر مرئی رشتہ ہے، جو ایک سچے سخنور اور حقیقی سخن فہم میں پایا جاتا ہے۔ آپ چاہیں تو اسے وجدانی رشتہ کہئے یا روحانی تعلق۔ اسی رشتہ اور تعلق کی بدولت وہ اقبال سے قریب تھے، اتنے قریب کہ جس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا، اور اسی قربت کے باعث انہوں نے اقبال کی روح کو پا لیا تھا! ان کی نظر میں اقبال، محض ایک سخن ور، فلسفی یا مفکر نہیں تھا، وہ قرآن کا شاعر اور شاعر کا قرآن تھا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ اقبال کی فکر کا سرچشمہ قرآن ہے

اوراس کی شاعری کے سوتے عشق رسول سے پھوٹے ہیں ——— اور بہادر خاں کو بہادر خاں حبّ قرآن اور عشق رسول ہی نے تو بنایا تھا۔ یہی ان دونوں میں قدر مشترک تھی۔ حقیقت میں نہ وہ شاعر، نہ یہ مقرر، دونوں کے دونوں قرآن کے شیدائی اور محمد کے فدائی! یہی ان دونوں کا غیر مرئی، وجدانی اور روحانی رشتہ تھا!!

اقبال کو انہوں نے نہ صرف پڑھا اور سمجھا تھا بلکہ اس کے کلام و پیام کی روح کو اپنے اندر جذب کر لیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اقبال کا "قال" ان کا "حال" بن گیا! وہ فرماتے تھے کہ جب مجھے اپنی جاگیر، خطاب اور مناسب دستبرداری کا مرحلہ پیش آیا تو میں نے اپنے طور پر بھی غور کیا اور اپنے مخلصوں سے بھی مشورہ کیا۔ عجیب گومگو کا عالم تھا کہ اقبال کے صرف ایک شعر نے میری مشکل حل کر دی۔

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

اور میں نے ایک لمحہ توقف کئے بغیر دنیا کی آلائشوں کو جھٹک کر اپنے دامن کو پاک کر لیا" ——— اقبال نے مرد مومن اور مرد قلندر کی بڑی دلکش اور جاذب نظر تصویر اپنے اشعار میں کھینچی ہے۔

یہ تصویر بہادر خاں سے مشابہ ہی نہیں، بہادر خاں ہی کی دکھائی دیتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ مجسم فکر اقبال تھے جبھی تو بین الاقوامی شہرت یافتہ سائنس دان ڈاکٹر رضی الدین صدیقی سابق وائس چانسلر جامعہ عثمانیہ و اسلام آباد یونیورسٹی کہا کرتے تھے کہ بہادر یار جنگ کو دیکھ کر دانائے راز کے اسرار و رموز فاش ہو جایا کرتے تھے!

سیّد عبدالواحد معینی

حیدرآباد دکن سے علامہ اقبال کے تعلقات

حیدرآباد دکن سے اقبال کا ذہنی تعلق

یادش بخیر حیدرآباد کے سایہ عاطفت میں ہندو پاکستان کے ہی نہیں بلکہ دنیاء اسلام کی بعض بزرگ ہستیوں نے بھی فیض پایا ہے۔ چنانچہ جب جمال الدین افغانی کے لئے دنیا کی عیسائی طاقتوں نے یورپ، افریقہ اور ایشیا میں رہنا محال کر دیا تھا تو سید صاحب مرحوم نے آخر حیدرآباد خجستہ بنیاد ہی میں آکر دن گذارے تھے۔ ان واقعات کو دیکھتے ہوئے باعث تعجب ہوتا، اگر علامہ مرحوم کو دولت خداداد حیدرآباد سے ایک روحانی اور ذہنی تعلق نہ ہوتا۔ یہ بات ضرور ہے کہ بعض کج فہموں کی ریشہ دوانیوں کے نتیجہ میں علامہ مرحوم کو قدرت نے یہ موقعہ نہ دیا کہ وہ براہ راست اس عظیم سلطنت کی خدمت کرتے مگر جو محبت علامہ کو اس سلطنت سے تھی وہ ان کے کلام اور خطوط سے ظاہر ہے۔

پہلا سفر حیدرآباد

اوائل زندگی میں تو مصروفیات زمانہ نے علامہ کو اس کی اجازت نہ دی کہ علامہ حیدرآباد جائیں۔ مگر یورپ سے حصول تعلیم کے بعد واپسی پر علامہ پہلی بار ۱۹۱۰ء میں حیدرآباد تشریف لے گئے۔ اس وقت سر اکبر حیدری ریاست میں معتمد فنانس تھے۔ اور سر اکبر حیدری سے انکی عزیزہ جناب عطیہ بیگم صاحبہ نے تعارف کرایا تھا۔ لہذا علامہ نے سر اکبر حیدری کے دولت کدہ پر قیام کیا۔ حیدرآباد کے قیام کے دوران علامہ نے

حیدرآباد کی بیشتر برگزیدہ ہستیوں سے ملاقات کی۔ یہ زمانہ مہاراجہ کشن پرشاد کی وزارت عظمیٰ کا تھا اور علامہ حیدرآباد کے قیام کے دوران اکثر مہاراجہ بہادر کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے تھے۔ اس درویش صفت اور فقیر منش امیر کے اخلاق حمیدہ کا جو اثر علامہ کی طبیعت پر ہوا اس کا اظہار علامہ نے ان اشعار میں کیا تھا۔

آستانہ پر وزارت کے ہوا میرا گذر — بڑھ گیا جس سے مرا ملک سخن میں اعتبار
اس قدر حق نے بنایا اس کو عالی مرتبت — آسمان اس آستانے کی ہے اک موج غبار
ہے یہاں شان امارت پردہ دار شان فقر — خرقہ درویشی کا ہے زیر قبائے زرنگار
شکریہ احسان کا اے اقبال لازم تھا مجھے — مدح پیرائی امیروں کی نہیں میرا شعار

اسی قیام کے دوران علامہ کی حیدرآباد کے اکثر عمائدین سے ملاقاتیں ہوتی رہیں ان میں سے ایک حضرت نظم طباطبائی پروفیسر نظام کالج حیدرآباد بھی تھے۔ حضرت نظم ۱۶ محرم ۱۲۶۹ھ کو بمقام حیدر گنج لکھنؤ میں پیدا ہوئے تھے۔ سولہ برس کی عمر تک آپ نے وطن میں رہ کر عربی فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ بعد میں شاہان اودھ کے شاہزادوں کی اتالیقی کے لئے منتخب ہوئے۔ اور کلکتہ چلے گئے۔ مٹیا برج پہنچ کر استادی کے ساتھ ساتھ حصول علم کا مشغلہ بھی جاری رکھا۔ جب واجد علی شاہ کا انتقال ہوگیا تو حضرت نظم کا حیدرآباد کے نظام کالج میں پروفیسر کی حیثیت سے تقرر ہوگیا۔

تیس سال تک وہ نظام کالج میں پروفیسر رہے۔ وظیفہ پر سبکدوش ہونے کے بعد مختلف اسامیوں پر وہ کام کرتے رہے جب جامعہ عثمانیہ کے ساتھ دارالترجمہ کا قیام عمل میں آیا تو دارالترجمہ میں ناظر ادبی کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا۔ بالآخر ۲۲ مئی ۱۹۳۲ء کو اردو زبان اس قابل قدر ہستی کی خدمات سے ہمیشہ کے لئے

محروم ہوگئی۔ انگریزی کی مشہور نظم "گریز ایلجی" Grays Elegy کا منظوم ترجمہ حضرت طباطبائی نے اردو میں "گور غریبان" کے نام سے کیا تھا۔ تاریخ ادب میں ایسا کامیاب ترجمہ ملنا محال ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علامہ نے حیدرآباد پہنچتے ہی سر اکبر حیدری سے درخواست کی تھی کہ انکی حضرت نظم طباطبائی سے ملاقات کا انتظام کرادیں۔ چنانچہ سر اکبر نے علامہ کی حضرت نظم کے ساتھ ملاقات کا انتظام عبدالرزاق صاحب مرتب کلیات اقبال کے توسط سے کرایا تھا۔ اس ملاقات کے وقت عبدالرزاق صاحب بھی موجود تھے۔ علامہ نے جب حضرت نظم سے کلام سنانے کی فرمائش کی تو انہوں نے یہ اشعار سنائے۔

پردۂ ظلمت سے نکلا روئے سلمائے سحر	ناقۂ گردون کی کھینچی لیلیٰ شب نے مہار
ہے شفق یا وادیٔ فیروزہ گوں میں لالہ زار	ہے سحر یا سبزۂ زار آسمان میں آبشار
چاہ سے نکلے ہیں یوسف یا ہتے تارا صبح کا	یا بناگوش زلیخا میں ہے درِ شاہوار
آفتاب آیا نظر سر در گریبان افق	ہوگئی غائب شب یلدا ہوئی صبح آشکار
آتش افروزی جو کی مشرق میں پیر صبح نے	ہوگیا مغرب میں پنہاں ساحرِ زنار دار
آنکھ ابھی محو تماشا تھی کہ بجھ کر رہ گئے	یاالٰہی جلوۂ انجم تھا یا رقص شرار
حصن خاور میں ہوئی فوج کواکب جاگزیں	ہوگیا لشکر پہ غالب ایک ترک نیزہ دار

مولوی عبدالرزاق صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت نظم کے اشعار سن کر علامہ اقبال عش عش کر رہے تھے۔ اور انکی طبیعت پر اتنا اثر ہوا کہ آخرکار انہوں نے اسی موضوع یعنی طلوع سحر پر خود بھی ایک نظم کہہ ڈالی جس میں اپنے قیام حیدرآباد

کے دوران مہاراجہ کشن پرشاد کی نوازشوں کا ذکر بھی کر دیا۔ یہ نظم "نمود صبح" کے نام سے "بانگ درا" میں موجود ہے اور ہم کو دو عظیم المرتبت شعرا کی ایک یادگار ملاقات کی آج بھی یاد دلاتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ نظم کے بہت سے اشعار علامہ نے طباعت کے وقت حذف کر دیئے تھے[1]۔ نظم کے ساتھ علامہ نے یہ شذرہ بھی تحریر کیا تھا "گذشتہ مارچ ۱۹۱۰ء میں مجھے حیدر آباد جانے کا اتفاق ہوا اور وہاں آستانۂ وزارت پر حاضر ہونے اور عالی جناب ہز ایکسیلنسی مہاراجہ سر کشن پرشاد جی۔ سی۔ آئی۔ ای یمین السلطنت پیش کار وزیر اعظم دولت آصفیہ المتخلص بہ شاد کی خدمت بابرکت میں باریاب ہونے کا فخر بھی حاصل ہوا۔ ہز ایکسیلنسی کی نوازش کریمانہ اور وحدت اخلاق نے جو نقش میرے دل پر چھوڑا۔ وہ میری لوح دل سے کبھی نہ مٹے گا۔ مزید الطاف یہ کہ جناب ممدوح نے میری روانگی حیدر آباد سے پہلے ایک نہایت تلطف آمیز خط لکھا اور اپنے کلام شیریں سے شیریں کام فرمایا"۔

مولوی عبدالرزاق صاحب کلیات اقبال میں تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت نظم طباطبائی سے گفتگو کے دوران علامہ "جی ہاں" کے بجائے "ہاں جی" فرماتے تھے۔ اس کے متعلق ملاقات کے بعد حضرت نظم نے فرمایا تھا کہ یہ پنجاب کی بود و باش کا اثر ہے۔

علامہ نے حیدر آباد کے اس قیام کے دوران ایک اور نظم لکھی تھی جسکا عنوان ہے "گورستان شاہی"، اس نظم کے بعض اشعار میں انگریزی شاعر گرے کی مشہور نظم "گور غریباں" کا اثر نمایاں ہے بہت ممکن ہے کہ یہ اثر جناب نظم کی ملاقات کی وجہ سے پیدا ہوا ہو۔

---

[1] یہ مکمل نظم معہ حذف شدہ اشعار "حیدر آباد دکن" "طلوع" کے زیر عنوان "کلیات اقبال (مرتبہ عبدالرزاق راشد) میں شائع ہوئی تھی اور سکو اس کتاب میں بھی ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

یہ نظم مخزن میں شائع ہوئی تھی اور اس نظم کے ساتھ علامہ نے حسب ذیل شذرہ بھی تحریر کیا تھا۔ "حیدر آباد میں مختصر قیام کے دنوں میں میرے عنایت فرما جناب مسٹر نذر علی حیدری صاحب بی۔ اے معتمد محکمہ فنانس کی قابل قدر خدمات اور وسیع تجربہ سے دولت آصفیہ مستفید ہو رہی ہے۔ مجھے ایک شب ان شاندار مگر حسرت ناک گنبدوں کی زیارت کو لیئے گئے جن میں سلاطین قطب شاہی سو رہے ہیں۔ رات کی خاموشی، ابر آلود آسمان اور بادلوں میں سے چھن کے آتی ہوئی چاندنی نے اس پر حسرت منظر کے ساتھ مل کر میرے دل پر ایسا اثر کیا جو کبھی فراموش نہ ہوگا۔ ذیل کی نظم انہی بے شمار تاثرات کا ایک اظہار ہے۔ اس کو میں اپنے سفر حیدر آباد کی یادگار میں مسٹر حیدری اور ان کی لیئق بیگم صاحبہ مسز حیدری کے نام سے منسوب کرتا ہوں۔ جنہوں نے میری مہمان نوازی اور میرے قیام حیدر آباد کو دلچسپ ترین بنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔"

اس نظم کا آخری شعر ہے:

ہو چکا گو قوم کی شانِ جلالی کا ظہور
ہے مگر باقی ابھی شانِ جمالی کا ظہور

حیدر آباد کے قیام کے بعد علامہ اورنگ آباد تشریف لے گئے۔ اورنگ آباد میں حضرت عالمگیر کے مزار پر انوار کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ اس زیارت کا جو اثر علامہ کے دل پر ہوا اس کا اظہار انہوں نے ان اشعار میں کیا ہے:

شاہ عالمگیر گردوں آستان
اعتبار دودمان گورگان

درصف شاہنشہاں یکتا ستے
فقرا د از ترتبش پیدا ستے

حیدرآباد سے واپس لاہور آکر علامہ نے محترمہ عطیہ بیگم کو ایک خط لکھا تھا۔ اس میں اس بات کا خاص طور پر ذکر کیا تھا کہ وہ سر اکبر حیدری کے مکان میں ایسے ہی رہے جیسے کہ وہ انہی کا گھر تھا۔ اور یہ بھی لکھا کہ سفر کے دوران ایسے بے تکلف گھریلو ماحول کا لطف ان کو اس سے قبل زندگی میں صرف ایک بار آیا تھا اور وہ ان کے شفیق استاد سر ٹامس آرنلڈ کے مکان میں آیا تھا۔

دوسرا سفر

علامہ نے حیدرآباد کا دوسرا سفر ۱۹۲۰ء یا ۱۹۲۱ء میں کیا۔ اس سفر کے دوران علامہ کس کے مہمان رہے، اور کن کن اصحاب سے انہوں نے ملاقاتیں کیں، اس کے متعلق کچھ معلومات فراہم نہ ہو سکیں۔ مگر اسی سفر کا ذکر جناب احمد محی الدین رضوی چیف سیکرٹری حکومت نظام اور نواب فضل نواز جنگ صدر المہام (وزیر) مالگذاری نے بڑے وثوق کے ساتھ کیا تھا۔ اس موقعہ پر علامہ کے اعزاز میں سول سروس ہاؤس میں ایک عشائیہ ترتیب دیا گیا تھا جس میں سر اکبر حیدری بھی موجود تھے۔ نواب فضل نواز جنگ نے اس موقع پر ایک تقریر کی تھی جس میں علامہ کا خیر مقدم کیا تھا اور جملہ حاضرین کے اشتیاق کے پیش نظر علامہ کی زبان فیض ترجمان سے ان کا کلام سننے کی فرمائش کی تھی۔ مگر علامہ نے بات ٹال دی اور کلام سنانے پر راضی نہ ہوئے۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ بعض احباب کو اس میں شبہ ہے کہ علامہ ۲۰ء یا ۲۱ء میں واقعی حیدرآباد تشریف لے گئے تھے یا نہیں۔

تیسرا سفر

علامہ تیسری اور آخری بار حیدرآباد جنوری ۱۹۲۹ء میں تشریف لے گئے تھے۔ علامہ کو جامعہ عثمانیہ کی جانب سے فلسفہ پر توسیعی تقاریر کے سلسلہ میں مدعو کیا گیا تھا۔ ۱۵ جنوری کو ٹاؤن ہال میں جب علامہ نے پہلی تقریر کی تو علامہ کے پرانے دوست مہاراجہ کشن پرشاد بہادر نے اس جلسہ کی صدارت کی تھی۔ مہاراجہ بہادر نے جن الفاظ میں علامہ کا تعارف حاضرین جلسہ سے کرایا تھا۔ ان سے ان کے خلوص اور محبت کا اظہار ہوتا ہے۔ تعارف کرتے ہوئے مہاراجہ نے فرمایا:۔

جامعہ عثمانیہ کی دعوت پر سر اقبال کی عالمانہ تقاریر کے سلسلے میں پہلے لیکچر کی صدارت میرے لئے ایک نہایت خوشگوار فریضہ ہے۔ اس موقعہ پر صدارت کا فریضہ میرے لئے آسان یوں ہوگیا ہے کہ ڈاکٹر اقبال کے تعارف کی اس لئے ضرورت نہیں کہ اس ملک کا ہر فرد آپ کے کلام سے واقف اور آپ کے کلام سے اس مجمع کا ہر فرد اپنی استعداد اور ذوق کی مناسبت سے قدردان ہے۔ آپ کی ذات تعارف سے مستغنی اور آپ کا کلام ستائش سے بالاتر ہے۔"

دوسرے لیکچر کی صدارت دکن کے فاضل بے بدل سر امین جنگ نے فرمائی تھی۔ لیکچر کے آغاز سے پہلے سر امین جنگ نے موقعہ کی مناسبت سے علامہ کا یہ شعر پڑھا:؎

غلام ہمت آن خود پرستم
کہ از نور خودی بیند خدا را

مہاراجہ بہادر نے علامہ کی تشریف آوری کے موقعہ پر ایک مشاعرہ بھی منعقد کیا تھا۔ اس مشاعرہ کا ذکر ایک صاحب نے یوں کیا ہے: "اقبالؒ مرحوم کی تشریف

آوری کے موقعہ پر جو مشاعرہ ہوا وہ بھی عجیب تھا۔ سر مہاراجہ نے اعلیٰ پیمانہ پر دعوت اور مشاعرہ کا اہتمام کیا تھا۔ حیدر آباد کے تمام شعراء مشہور فارسی و اردو مدعو تھے۔ چونکہ کوئی خاص طرح مقرر نہ تھی اس لئے حیدر آباد کے مشہور شعرا مثلاً طباطبائی مرحوم نواب ضیاء یار جنگ بہادر، نواب عزیز یار جنگ بہادر، مولوی مسعود علی محوی، جوش ملیح آبادی وغیرہ جیسے مستند شعرا نے اپنے نقطہ نظر سے اپنا بہترین کلام سنایا مگر اقبال ٹس سے مس نہ ہوئے۔ صرف محوی صاحب کے اس شعر پر

نگاہ کردن ِ زر دیدہ ام بہ بزم بہ دید میان چیدن گل باغبان گرفت مرا

اتنا ارشاد ہوا کہ پھر پڑھیئے

خدا جانے کسی نقص کی بنا پر کہا تھا۔ یا بطور قدر دانی کے جب خود ان سے کچھ پڑھنے کی فرمائش کی گئی تو بڑے اصرار کے بعد، چار پانچ شعر ارشاد فرمائے۔

علامہ نے جو شعر پڑھے وہ یہ تھے:۔

بگذر از خاور و افسونیٔ افرنگ شو
کہ نیرزد بجوے این ہمہ دیرینہ ونو

زندگی انجمن آرا و نگہدار خود است
اے کہ در قافلہ بے ہمہ شو با ہمہ رو

آن نگینے کہ تو با اہرمنان باختہ
ہم بجبریل امینے نتوان کرد گرو

جب علامہ حضور نظام سے ملنے کے لئے گئے تو جناب خلیفہ عبدالحکیم صاحب بھی ان کے ہمراہ تھے۔ پہلے تو حسب قاعدہ وہ محل کی کتاب حضوری میں اپنا نام لکھ

لکھ کر واپس ہو گئے۔ جب یہ کتاب حضور نظام کے ملاحظہ میں پیش ہوئی تو حکم ہوا کہ علامہ کو بلایا جائے۔ چنانچہ ہرکارہ دوڑا اور علامہ کو فرمان شاہی کی خبر دی گئی۔ علامہ واپس کنگ کوٹھی تشریف لے گئے۔ اور حضور نظام سے ملاقات کی۔

اس ملاقات کے دوران علامہ کا قیام مہمان خانہ شاہی میں ہوا تھا۔ اور علامہ کے ہمرکاب ڈاکٹر عبداللہ چغتائی چودھری محمد حسین اور علی بخش تھے۔

حیدرآباد کے معاملات سے علامہ اقبال کی دلچسپی

یہ تو تھی مختصر سی روئیداد ان سفروں کی جو علامہ نے حیدرآباد کے کئے مگر ان سفروں کے علاوہ بھی علامہ حیدرآباد کے معاملات میں ہمیشہ دلچسپی لیتے رہے۔ جامعہ عثمانیہ کے قیام کے متعلق حیدرآباد کے ارباب اثر ہمیشہ علامہ سے مشورہ پر کاربند ہوتے رہے۔ اور جامعہ میں تقررات کے متعلق علامہ کی رائے کو ایک اہم مقام حاصل تھا۔ جناب جوش ملیح آبادی اور خلیفہ عبدالحکیم صاحب کا تقرر علامہ کی سفارش پر ہی ہوا تھا۔ علامہ ایک عرصہ تک حیدرآباد سول سروس کے ممتحن تھے۔ اور ان کے خوبصورت خط میں لکھے ہوئے امتحان کے پرچے سول سروس ہاؤس حیدرآباد میں محفوظ تھے۔

حیدرآباد کی آزادی سے متعلق اقبال کی ایک اہم تجویز

۱۹۳۱ء اور ۱۹۳۲ء کی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں علامہ حیدرآباد کے وفد کو مفید مشورے دیتے رہے۔ ان مشوروں کی تفصیلات کا ذکر کانفرنس کی رپورٹوں میں تو نہیں ہے مگر بیشتر حاضرین کانفرنس کے علم میں تھا۔

ان کانفرنسوں میں ایک واقعہ ایسا بھی ہوا جس کا ذکر ہمارے لئے آج رنج اور

تاسف ہی کا باعث ہو سکتا ہے۔

ان کانفرنسوں کے دوران علامہ نے غیر رسمی طور پر تجویز پیش کی کہ نظام حیدر آباد کو ان کی سیاسی اہمیت اور ریاست کی عظمت دیکھتے ہوئے "ہز میجسٹی" کا خطاب دیا جائے ۔ انگلستان کے ارباب اقتدار کو اس تجویز سے اتفاق بھی تھا مگر سر اکبر حیدری نے اس تجویز سے اختلاف کیا علامہ نے اس واقعہ کا ذکر دہلی میں نواب بہادر یار جنگ مرحوم سے کیا۔ اور نواب صاحب مرحوم نے اس واقعہ کا ذکر نواب حسن یار جنگ بہادر کی موجودگی میں مجھ سے کیا تھا۔ اس واقعہ کا اثر علامہ کے حساس دل پر بہت ہوا تھا اور اسی اثر نے علامہ سے جاوید نامہ میں یہ اشعار لکھوائے !

کے شب ہندوستان آید بروز   مرد جعفر روح او زندہ ہنوز
تا ز قید یک بدن وا می دہد   آشیاں اندر تن دیگر نہد
گاہ او را با کلیسا ساز باز   گاہ پیش دیریان اندر نیاز
دین او آئین او سوداگری است
عنتری اندر لباس حیدری است

جب نواب بہادر یار جنگ نے یہ اشعار جاوید نامہ میں پڑھے تو انہوں نے علامہ کو ایک خط لکھا جس میں یہ دریافت کیا کہ کیا یہ اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر آپ نے ڈاکٹر انصاری مرحوم کے بنگلہ پر دہلی میں مجھ سے کیا تھا۔ اس خط کے جواب میں علامہ نے نواب صاحب مرحوم کو ایک پوسٹ کارڈ بھیجا جس میں تحریر کیا تھا "میں خوش ہوں کہ آپ میرے کلام کو اس غور و خوض سے پڑھتے ہیں"۔ یہ کارڈ نواب صاحب مرحوم کے پاس آخر وقت تک محفوظ تھا۔

علامہ کے انتقال سے پہلے حیدر آباد کے ارباب اقتدار سے ایک ایسی حرکت سرزد ہو گئی جو نہ ہوتی تو اچھا ہوتا۔ اس واقعہ سے متاثر ہو کر علامہ نے ایک قطعہ لکھا جس کا عنوان ہے "سر اکبر حیدری کے نام" اس قطعہ کی شان نزول علامہ نے اپنے الفاظ میں یوں لکھی ہے۔

"یوم اقبال کے موقعہ پر توشہ خانہ حضور نظام کی طرف سے جو صاحب صدر اعظم کے ماتحت ہے ایک ہزار روپیہ کا چیک بطور تواضع موصول ہونے پر"۔ قطعہ یہ ہے:

تھا یہ اللہ کا فرمان کہ شکوہ پرویز
دو قلندر کو کہ نہیں اس میں ملوکانہ صفات
مجھ سے فرمایا کہ لے اور شہنشاہی کر
حسن تدبیر سے دے آنی و فانی کو ثبات
میں تو اس بار امانت کو اٹھاتا سر دوش
کام درویش میں ہر تلخ ہے مانند نبات
غیرت فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول
جب کہا اس نے یہ ہے میری خدائی کی زکات[1]

---

[1] اس افسوس ناک واقعہ سے متعلق معین نواز جنگ جو اس زمانہ میں معتمد باب حکومت (کیبنٹ سیکرٹری) تھے کی تصریح ملاحظہ ہو موصوف فرماتے ہیں۔

"توشک خانہ عامرہ کا محکمہ تھا ہی اس لئے کہ اس کے فنڈ سے ملک اور بیرون ملک کے اہل کمال کا مالی اعانت اور خدمت کی جائے

حیدرآباد سے روحانی تعلق

ویسے حیدرآباد کو ہمیشہ علامہ سے ایک روحانی تعلق بھی رہا ہے دنیا جانتی ہے کہ علامہ کے استاد حضرت داغ حیدرآباد کے منصبدار تھے اور اب انتقال کے بعد حیدرآباد کی ہی سرزمین میں ابدی نیند سو رہے ہیں۔ اقبالیات کے مطالعہ کے لئے حیدرآباد ہمیشہ بڑا مرکز رہا ہے۔ علامہ کے کلام کا پہلا مجموعہ کلیات اقبال" مولوی عبدالرزاق صاحب نے حیدرآباد ہی سے شائع کیا تھا۔ جناب ڈاکٹر یوسف حسین خان صاحب کی معرکۃ الآرا تصنیف روح اقبال حیدرآباد سے شائع ہوئی تھی۔ پروفیسر غلام دستگیر رشید کے مرتب کردہ مجموعہ ہائے مضامین بھی حیدرآباد سے شائع ہوئے تھے۔ نواب بہادر یار جنگ کے دولت کدہ "بیت الامت" میں ہر ہفتہ درس

لیکن اس سلسلہ میں جو دفتری کارروائی ہوتی تھی، وہ راز میں رہتی تھی، صاحب معاملہ کو اس کا کوئی علم نہ ہوتا تھا، چنانچہ اکبر حیدری اکثر اس فنڈ سے اقبال کی خدمت کرتے رہتے تھے۔ اس واقعہ کے وقت ایک ہندو منتظم برسرکار تھا، اس نے عملاً یا ناواقفیت کی بنا پر چیک کے ساتھ ایک دفتری زبان میں خشک اور سپاٹ سا مراسلہ بھی اقبال کی خدمت میں روانہ کر دیا۔ اس کو پڑھ کر ان کا برانگیختہ ہو جانا عین فطری بات ہے۔ افسوس کہ قطعہ لکھنے کے اور رقم واپس کرنے کے چند ہی روز بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ اکبر حیدری کو ہمیشہ اس کا ملال رہا کہ وہ اس غیر متوقع واقعہ کی صفائی اور تلافی نہ کر سکے"

(منقول از اقبال اور حیدرآباد مصنفہ نظر حیدرآبادی)

اقبال ہوتا تھا۔ جس میں خود نواب صاحب مرحوم علامہ کے کلام کا بصیرت افروز درس دیتے تھے۔ یہ درس نواب صاحب مرحوم کے انتقال کے بعد بھی برسوں جاری رہا۔

مہاراجہ کشن پرشاد بہادر نے اپنے ایک خط میں لکھا تھا:۔

"اگر خلوص ہے تو خدا کی ذات سے امید ہے کہ اقبال سے حیدرآباد کا اقبال چمک جائیگا" یہ امر موجب رنج و تاسف ہے کہ بعض ذی اثر اشخاص کے رشک اور حسد نے نے مہاراجہ بہادر کی ان امیدوں کو جو انہوں نے حضرت علامہ کی ذات سے وابستہ کر رکھی تھیں۔ پورا نہ ہونے دیا مگر یہ حقیقت ہے کہ علامہ کا حیدرآباد سے ہمیشہ ایک گہرا روحانی تعلق رہا ہے اور اس مردم خیز خطہ کے لوگوں نے علامہ کے کلام اور پیغام کی تشریح میں ہمیشہ گہری دلچسپی لی ہے اور علامہ کی ذات سے ہمیشہ والہانہ محبت اور تعلق کا ثبوت دیا ہے"

اقبالؒ کے مقبرہ کا نقشہ

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ علامہ کے مقبرہ کا نقشہ حکومت حیدرآباد کی زیر ہدایت اس ریاست کے ایک مقتدر عہدیدار، میر تعمیر (چیف آرکیٹیکٹ) نواب زین یار جنگ نے تیار کیا تھا۔ نواب زین یار جنگ نے ایک بار فرمایا کہ انہوں نے مقبرہ کا ایک نقشہ حسب ہدایت سر اکبر حیدری تیار کیا تھا۔ اس میں مینار، دروازہ، روشن دان سب نہایت نازک اور نفیس تھے۔ جب نواب صاحب نے یہ نقشہ سر اکبر حیدری کو دکھایا تو صاحب موصوف نے نواب صاحب سے دریافت کیا کہ آپ علامہ کے پیغام اور ارشادات سے واقف ہیں یا نہیں۔ جب نواب صاحب نے جواب نفی میں دیا تو سر اکبر حیدری نے فرمایا کہ علامہ کا پیغام طاقت و قوت کا پیام ہے۔ اس کے بعد نواب صاحب نے مقبرہ

موجودہ نقشہ تیار کیا[1]

---

[1] زین یار جنگ نے نقشہ کو آخری شکل دینے سے پہلے لاہور کا سفر کیا۔ انہوں نے علامہ اقبال کے دوست احباب سے ملاقات کی، ان کے مشورے اور ہدایت کے مطابق نقشہ مکمل کیا۔

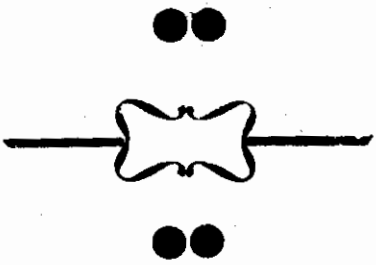

مولانا غلام محمدؒ

اقبالیات اور حیدرآباد

اہل کمال کی قدر افزائی میں سبقت، عہد عثمانی کے حیدرآباد کا طغرائے امتیاز تھا، حکیم مشرق علامہ اقبال مرحوم کے فضل و کمال اور ہندی مسلمانوں کی بیداری میں اقبالی ادب کی گہری کارفرمائی کے اعتراف میں وہ پیچھے کیوں رہ جاتا، چنانچہ ہندوستان کا اولین "یوم اقبال" اقبال کی زندگی میں حیدرآباد ہی نے منایا اور کس تزک و احتشام کے ساتھ کہ سلطان اور عوام، صاحبان علم اور علم دوست سب ہی مفکر اسلام کو خراج تحسین پیش کرنے کے لئے ۹ جنوری ۱۹۳۸ء کو شہر کے ٹاؤن ہال میں جمع ہو گئے۔ پہلے اجلاس کی صدارت ولی عہد سلطنت نواب اعظم جاہ بہادر نے کی اور دوسرے اجلاس کی صدارت سابق وزیر اعظم مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد نے اور مقررین و اہل قلم کی صف میں کیسی ہستیاں تھیں، قائد ملت نواب بہادر یار جنگ سر اکبر حیدری، ڈاکٹر عبداللطیف، ڈاکٹر یوسف حسین خاں، ڈاکٹر محی الدین قادری زور وغیرہ اور شعراء دکن میں تھے، وجدؔ، میکشؔ اور مخدومؔ وغیرہ۔ اس ایک جلسہ ہی میں خاصہ قیمتی لٹریچر اقبال پر جمع ہو گیا ـــــ صدر اول نواب اعظم جاہ بہادر کے اس فقرہ سے اس عظیم الشان جلسہ کی غرض و غایت اور حیدرآباد کے جذبۂ قدر شناسی کا اندازہ لگائیے:

"اقبال نے اپنے فارسی اور اردو کلام کے ذریعے مشرق میں موجودہ نسل کی ذہنیت کو متاثر کیا ہے، بجا طور پر وہ دنیا کا بہت بڑا مفکر اور مصنف مانا جاتا ہے اور بحیثیت شاعر وہ بنی نوع انسان کے لئے ایک پیغام کا حامل ہے۔ یہی وہ خصوصیات ہیں جن کا حیدرآباد اعتراف کر رہا ہے"

یہ اعتراف ایک جلسہ کی دھوم دھام پر ختم ہو نہیں گیا بلکہ چوٹی کے اہل علم و دانش آگے بڑھے، انہوں نے حکمت اقبال اور پیام اقبال کی تشریح و توضیح کے سلسلہ میں ایسا ادب پیش کیا جس کے تذکرہ کے بغیر اقبالیات کی گراں باری ہلکی رہ جاتی ہے ذیل میں ہم اس ادب کا اجمالی تعارف پیش کرتے ہیں، ــــ پہلے تصانیف، پھر تالیفات پھر تراجم اور آخر میں رسائل کے خصوصی نمبر وغیرہ۔

اقبال کا تصور زمان و مکان

سنہ اشاعت ۱۹۴۲ء، ناشر ادارۂ اشاعت اردو (حیدرآباد دکن)
یہ کُل اڑتالیس صفحہ کا رسالہ ہے، کل کا کل مغز ہی مغز، اس کے مصنف جامعہ عثمانیہ کے فرزند جلیل، عالمی شہرت کے ماہر ریاضیات و طبیعیات ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی ہیں، اُس وقت وہ جامعہ کے صدر شعبہ ریاضی تھے، تصور زمان و مکان کے دقیق موضوع پر قلم رانی انہی کا حصہ تھا، اور جو کچھ انہوں نے اس موضوع پر لکھ دیا وہ آج بھی حرف آخر ہے۔ اس میں فاضل مصنف نے علامہ اقبال کے ایک خیال کی اصلاح بھی ان الفاظ میں کی تھی:

"دوسرے فلسفیوں کی طرح اقبالؔ نے بھی یہ خیال کیا کہ نظریۂ اضافیت نے وقت (زمان) کی حقیقت اور واقعیت کو فنا کر دیا ہے اور وقت کو فضا کی ایک چوتھی سمت بنا کر چھوڑ دیا ہے، اس طرح مستقبل ایک مقرر کردہ چیز بن جاتا ہے جو اسی طرح متعین ہے جیسے ماضی۔ اس طرح زمان کی تخلیقی حرکت باقی نہیں رہتی اور کائنات میں تقدیر اور جبر کا دور دورہ ہو جاتا ہے۔ نظریہ اضافیت کا یہ تصور جو فلاسفر اور ان کے ساتھ اقبالؔ نے لیا ہے، صحیح نہیں ہے"

آگے چل کر ڈاکٹر صاحب نے سمجھایا ہے کہ وقت (زمان) چوتھی سمت ضرور ہے مگر فضا (مکان) کی نہیں بلکہ زمان و مکان کی چوتھی سمت ہے اور یہ کہ نظریہ اضافیت میں وقت (زمان) اتنا ہی حقیقی ہے جتنا کہ فضا۔

اس تصحیح خیال سے متاثر ہو کر علامہ اقبال نے ڈاکٹر صاحب سے "نظریۂ اضافیت" پر لکھنے کی فرمائش کی اور اس عاشق اقبال نے فوراً قلم اٹھایا مگر قضا و قدر کے آگے کس کی پیش گئی ہے۔ ابھی اس کتاب کا تیسرا باب ہی لکھا جا رہا تھا کہ علامہ اقبال عالم عقل و فکر سے گذر کر مشہور کے عالم میں جا پہنچے جہاں کوئی مسئلہ لاینحل نہیں ہے!

اقبال کا فلسفۂ موت و حیات

یہ ڈاکٹر رضی الدین صاحب کا ایک اور مقالہ ہے جو انھوں نے ایک اور "یوم اقبال" میں پڑھا تھا۔ اور پھر کتابی شکل میں شائع کر دیا گیا۔ اقبال کے فلسفۂ خودی سے بالکل ملا ہوا مسئلہ فلسفۂ موت و حیات کا ہے۔ اتنا ہی دقیق اور نازک اس گہرائی کو ڈاکٹر صاحب نے اپنے استادانہ قلم سے جس قدر پایاب اور صاف

کر کے پیش فرمایا ہے، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کا فوراً ہی ترجمہ "الحیاۃ والموت فی فلسفۃ اقبال" کے زیر عنوان عربی زبان میں بھی ہو گیا۔ تاکہ جس بصیرت سے اہل ہند نفع اندوز ہیں اہل عرب بھی اس سے مستفید ہو سکیں، اقبالیات پر عربی زبان میں یہ پہلی چیز ہے جو پروفیسر حسن الاعظمی کے ذریعہ منتقل ہو کر عرب دنیا کے سامنے آگئی تھی۔

روح اقبال

اشاعت ۱۹۴۲ء ناشر ادارہ اشاعت اردو یہ ڈاکٹر یوسف حسین خان صاحب صدر شعبۂ تاریخ و سیاسیات جامعہ عثمانیہ کے عمیق مطالعہ کا ماحصل ہے اور شاہکار ہے! آرٹ۔ تمدن اور مذہب کی سہ گانہ تقسیم کے ساتھ ڈاکٹر صاحب نے زندگی اور کائنات کے بارے میں حکیم مشرق کے افکار کی نہایت محققانہ توضیح فرمائی ہے۔ راقم الحروف کو یاد ہے کہ جب وہ الہیاتی مسائل پر لکھ رہے تھے تو وقتاً فوقتاً استاد گرامی منزلت علامہ مناظر احسن گیلانیؒ سے استفادہ فرماتے رہے تھے،

اس تصنیف کا سب سے کامیاب باب اس کا درمیانی باب ہے یعنی اقبال کا فلسفۂ تمدن، پہلے باب یعنی "اقبال اور آرٹ" کا رتبہ اس کے بعد آئیگا اور تیسرے باب یعنی اقبال کے مذہبی اور مابعد الطبعی تصورات" میں مصنف گرامی اس درجہ کامیاب نظر نہیں آتے، اس کی وجہ اس میدان میں خود فلسفہ کی اپنی الجھنیں اور حقیقت تک رسائی بھی ہو سکتی ہے۔ ——— یہاں یہ چیز محض ابواب کے مراتب کی درجہ بندی کے اعتبار سے ظاہر کی گئی ہے ورنہ بحیثیت مجموعی آج بھی اقبالیات میں یہ کتاب درجۂ اول کی تصانیف میں شمار ہوتی ہے اور پہلی جامع پیش کش ہونے کے اعتبار سے تو اسکی عظمت کا کوئی حریف نہیں۔

اقبال فن وفکر

سنہ اشاعت ۱۹۴۴ مطبوعہ گورنمنٹ پریس حیدرآباد (دکن) سید عبدالواحد صاحب ایم۔ اے (آکسن) اقبالیات کے مشہور مصنف ہیں، حیدرآباد میں جب وہ ناظم جنگلات (فارسٹ کمشنر) کے عہدہ پر فائز تھے تو یہ کتاب انگریزی زبان میں وہیں تصنیف فرمائی تھی، اس کتاب میں سید صاحب نے اقبال کے ذہنی عوامل اور فکری نشوونما کے محرکات کو خاصی تفصیل سے پیش کیا ہے۔ سید صاحب نے علامہ کا یہ امتیاز بھی ظاہر کیا ہے کہ وہ بیک وقت چوٹی کے شاعر اور اونچے انشاء پرداز تھے اور یہ کہ انشاء پردازی میں ان کا قلم اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں یکساں جوہر دکھاتا ہے۔

زبان انگریزی میں اب تک اقبال پر جو کچھ لکھا گیا ہے۔ اس میں سید صاحب کی یہ تصنیف منفرد مقام رکھتی ہے۔

رموز اقبال

سنہ اشاعت ۱۹۴۴۔ ناشر ادارۂ نشریات اردو حیدرآباد دکن

جامعہ عثمانیہ سے جو اہل کمال ابھرے ان میں ڈاکٹر میر ولی الدین مرحوم (سابق صدر فلسفۂ جامعہ عثمانیہ) کا مقام بہت بلند ہے، وہ فلسفہ کے پی ایچ۔ ڈی قانون کے بار ایٹ لا اور ساتھ ہی منشی فاضل تھے۔ اقبالؒ سے جتنی مناسبتیں ان کو حاصل تھیں۔ کم کسی کو میسر آئی ہیں۔ اس لئے مفکر اسلام اور حکیم مشرق کے فلسفۂ خودی و بیخودی کی رمز شناسی کا حق انہیں کو حاصل تھا اور انہی کی تشریحات مستند سمجھی جانی چاہئیں۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے "رموز اقبال" کے زیر عنوان ایک سو

اسی صفحات کی ایک کتاب مرتب کردی، اس کتاب پر بہترین تبصرہ خود مصنف کے قلم سے کتاب کی تمہید میں آگیا ہے، جو یہ ہے:

"اقبال، دانائے راز سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ عہد حاضر کی تہذیب نے انسانوں کی ذہنیت میں کیا انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ تصورات، نظریات، عقائد، اقوال و اعمال میں کیا تغیر پیدا ہوگیا؟ مسلمان کی زندگی اصل میں کیا ہے؟ اس کے عقائد کیا ہیں؟ اور اعمال کی نوعیت کیا ہے؟ عقل و عشق کا اسکی زندگی میں کیا مقام ہے؟ اس کے علم کی بنیاد کیا ہے؟ اور ایمان پر اس کے اعمال کا انحصار کس حد تک ہے؟ قرآن کریم نے اسکی خودی کا اس کو کیا علم بخشا ہے؟ خودی کے عرفان کے بعد مسلمان میں کیا تغیر پیدا ہو جاتا ہے؟ اپنی حقیقت و ماہیت سے واقف ہو کر انسان کے نقطۂ نظر میں کیا تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے؟ خود کو فقیر، امین اور خلیفۂ جان کر انسان کس طرح آفاق کو اپنے اندر سمو لیتا ہے اور کائنات کو مسخر کر لیتا ہے؟

——— انہی سوالات کے جواب آپ کو پیش نظر کتاب میں ملینگے!"

راقم الحروف کے نزدیک سرِ اقبال کو پانے کے لئے اس کتاب سے استغنا محرومی ہی کا سبب ہو سکتا ہے، یہی وصف اس کی عظمت کے لئے کافی ہے۔

اقبال کا سیاسی کارنامہ

سنہ اشاعت ۱۹۵۲ء۔ ناشر کاروان ادب کراچی یہ جناب

محمد احمد خان (ایم۔ اے۔ ایل ایل بی) کی تصنیف ہے، خان صاحب بہادر علمی جامعۂ عثمانیہ کے آخری دور کے صف اول کے فرزندوں میں شامل ہیں۔ کتاب کا عنوان ہی ان کے غیر تقلیدی غور و فکر کی نشاندہی کر رہا ہے۔ ان کے غور و فکر کا مرکز علوم سیاست و معیشت رہے ہیں، پھر انھوں نے قائد ملت نواب بہادر یار جنگ مرحوم سے سیاسیات کا علمی درس بھی لیا ہے۔ بالطبع وہ ٹھوس محققانہ علمی مزاج کے آدمی ہیں۔ کلام اقبال اور نگارشات اقبال جب ان کے سامنے آئیں تو اِن میں ان کی نگاہ کا علامہ کے سیاسی کارنامہ کے تعین اور اس کے اظہار پر مرتکز ہو جانا عین فطری تھا، انھوں نے ڈوب کر دیکھا اور اقبال کے ـــــ سیاسی کارنامہ کو اس قوت و بسط کے ساتھ پیش کیا کہ اس موضوع پر یہ کتاب پہلی بھی رہی اور اب تک آخر بھی۔

شکر کا مقام ہے کہ پاکستان میں بھی اسکی خوب قدر شناسی ہوئی اور ـــــ یہ کتاب حکومت پاکستان کی قائم کردہ کمیٹی برائے جشن صد سالہ اقبال کی طرف سے بڑے اہتمام کے ساتھ دوبارہ شائع ہو چکی ہے۔

اقبال کی کہانی کچھ میری اور کچھ ان کی زبانی

پروفیسر ظہیر الدین احمد الجامعی، جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ دینیات میں معقولات

ڈاکٹر ظہیر صاحب مرحوم جب پاکستان آ گئے تھے تو راقم الحروف ہی نے انکا تعارف ممتاز حسن صاحب مرحوم صدر اقبال اکادمی کراچی سے کرایا تھا اور پھر وہ اس اکیڈمی سے کچھ عرصہ متعلق بھی رہے تھے ڈاکٹر صاحب مصنف سے زیادہ خطیب اچھے تھے اور اقبال کے فلسفۂ موت اور دو ایک ایسے موضوعات پر انہوں نے معرکہ کی تقریریں کی تھیں۔

قدیم کے استاد تھے، جامعہ ازہر مصر کے سند یافتہ اور اقبال سے غائبانہ درجہ شغف رکھنے والے اور ان سے شخصی تعارف کا شرف بھی پائے ہوئے۔ انہوں نے اس عنوان کے تحت ایک دلچسپ پیرایہ میں اقبال کے شعر و حکمت کی بھی تشریحات پیش کی ہیں اور بعض شبہات کا ازالہ بھی کیا ہے اور چند واقعات جزئا معلوم تھے ان کا اظہار بھی کر دیا ہے۔

اقبال نئی تشکیل

یہ پروفیسر عزیز احمد کی تصنیف ہے، عزیز احمد صاحب رہے تو کچھ عرصہ انگریزی کے استاد مگر انہیں ترقی پسند اردو ادیبوں میں بھی ایک مقام حاصل تھا "مرمر اور خون" ان کا مشہور ناول ہے۔ خیالات میں علامہ اقبال سے ظاہر ہے کہ ان کو کیا مناسبت ہو سکتی تھی۔ پھر بھی انہوں نے اقبال پر قلم اٹھایا اور اسکو اپنے فکری سانچہ میں ڈھالکر پیش کر دیا۔ تقریباً چھ سو صفحات کی اس ضخیم کتاب میں عزیز احمد صاحب نے علامہ اقبال کی فکری حیات کو تین ادوار میں پیش کیا ہے (۱) وطن پرستی (۲) اسلامی شاعری (۳) انقلابی شاعری۔

اقبالیات میں اس کتاب کا مقام صرف یہ ہو سکتا ہے کہ ایک غیر اقبالی فکر رکھنے والے کی اقبال پر تصنیفی زحمت کشی کا یہ مرقع ہے۔

متاع اقبال

سنہ اشاعت ۱۹۳۹ء اس کے مصنف کا اسم گرامی ہے جناب ابوظفر عبدالواحد غالباً انگریزی ادب کے پروفیسر، ان کی یہ کتاب شائع ہو کر وقتی طور پر مقبول رہی مگر مدت سے نایاب ہے!

مقام اقبال سید اشفاق حسین صاحب "ریسرچ اسکالر" جامعہ عثمانیہ نے یہ کتاب لکھی

تھی جو ۱۹۴۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ اسکو پڑھ کر اس وقت کے مشہور صحافی قاضی عبدالغفار مرحوم نے اپنے ایک ریڈیائی نشریہ میں یہ فرمایا تھا کہ "اقبال کے متعلق یہ پہلی تصنیف ہے جسے پڑھ کر میں اقبال کے مقام کو سمجھ سکا" ـــــ یہ کتاب دراصل اشفاق حسین صاحب کے "ریسرچ اسکالر" والی سند کا مقالہ ہے۔ اُن دنوں جامعہ عثمانیہ میں ایم۔ اے کے بعد ہی سند دی جاتی تھی جو پی۔ ایچ۔ ڈی کی متبادل صورت تھی۔ اسی سے اس کتاب کے علمی پایہ کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

قرآن اور اقبال

ایک نیک نہاد درویش صفت عالم مولانا ابو محمد مصلح تھے، جنہوں نے شہر حیدرآباد سے "عالمگیر تحریک قرآن مجید" کے نام[1] سے ایک تحریک چلائی تھی گو چل نہ سکی، ان کی علامہ اقبال سے ملاقات بھی رہی تھی اور خط و کتابت بھی تھی، یہ کتاب انہی کی تصنیف ہے، قرآن پاک کی روشنی میں اقبال کے پیغام کے منشاء کی تشریح کی کوشش اس کتاب میں کی گئی ہے۔

اقبال پر فارسی میں رسالہ

یہ دراصل وہ خطبہ ہے جو "فرہنگِ نظام" کے مؤلف آنائے سید محمد علی داعی اسلام نے علامہ اقبال کی شاعری کی معنویت اور خوبی پر دیا تھا، آنائے محمد علی ایرانی نژاد تھے اور نظام کالج حیدرآباد دکن میں فارسی کے پروفیسر، ان کا یہ رسالہ (۴۶) صفحات میں آیا ہے اور ایک ایرانی اہل زبان کی طرف سے اقبال پر پہلی پیش کش ہونے

---

[1] مولانا کی تحریک سے ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کو دلچسپی لیتا دیکھ کر راقم السطور بھی اپنے چند احباب کے ساتھ ان سے قریب ہوگیا تھا۔ مگر کچھ نہ پاکر ہم سب ہی وہاں سے ہٹ گئے تھے۔

کے اعتبار سے حیدرآباد کے لیے باعث افتخار ہے۔

یہ تھیں قابل ذکر تصانیف اب ایک جائزہ تالیفات کا بھی!

آثار اقبال، فکر اقبال، حکمت اقبال

یہ تین گراں قدر تالیفات پروفیسر ادب فارسی جناب غلام دستگیر رشید ایم۔ اے عثمانیہ کے ہاتھوں اہل علم حضرات کے سامنے آئیں رشید صاحب اس وقت نظام کالج حیدرآباد میں فارسی ادب کے استاد تھے، پھر ڈاکٹریٹ کرکے جامعہ عثمانیہ میں شعبۂ فارسی کے صدر رہے اور اب ریٹائرڈ لائف گذار رہے ہیں۔ اقبال اور اقبالیات سے ممدوح کو خاص شغف رہا ہے۔ اقبال پر اہل کمال نے جو کچھ لکھا ہے اس میں سے مقالات اور مضامین کا انتخاب کوئی آسان کام نہیں، جواہر کی درجہ بندی اور رشتہ دوزی ایک صاحب نظر جوہری ہی کر سکتا ہے۔ ڈاکٹر رشید نے ان تین تالیفات میں جو چار چار پانچ پانچ سو صفحات کی ضخامت رکھتی ہیں، اپنے کمال انتخاب کا ثبوت دیا ہے۔ یہ تالیفات ہندوستان کے طول و عرض میں وقعت کی نگاہ سے دیکھی گئیں۔

ان تالیفات میں جو مضامین آگئے ہیں وہ تقریباً سب ایسے ماہرین علم و فن کے قلمی شہ پارے ہیں جن کا نام ہی سند کا درجہ رکھتا ہے مثلاً ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، ڈاکٹر میر ولی الدین، ڈاکٹر عبداللہ، پروفیسر محمد مجیب محترم نذیر نیازی، مولانا عبدالماجد دریابادی، خود علامہ اقبال، ڈاکٹر عبداللطیف وغیرہ مگر اس کے ساتھ بعض دوسرے درجہ کی شہرت والے حضرات جیسے میر حسن الدین، مولانا راغب احسن، آنسہ عائشہ بلقیس عمر وغیرہ کے مضامین بھی شامل ہیں، حتیٰ کہ "آثار اقبال"

میں ایک مضمون اس راقم کم سواد کا تک شامل کر لیا گیا ہے[1] اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ انتخاب میں مولف گرامی کی نگاہ اصلاً مضامین کے معیار پر رہتی ہے نہ کہ محض مضمون نگار کے نام پر! یہی وجہ ہے کہ بعض حضرات کے مضامین جو ان تالیفات میں آنے ضروری تھے مگر انگریزی زبان میں تھے تو ترجمہ کرا کر شامل کر دیئے گئے ہیں۔

یہ تالیفات آج بھی فلسفہ اقبال اور پیام اقبال کے سمجھنے کی تڑپ رکھنے والوں کے لئے مختصر اقبالی انسائیکلوپیڈیا کا کام دے سکتی ہیں۔

مضامینِ اقبال

اشاعت ۱۳۶۲ھ مطبوعہ احمدیہ پریس چارمینار حیدرآباد دکن۔ مرتبہ تصدق حسین تاج۔ یہ علامہ اقبال کے اردو مضامین کا مجموعہ ہے اس میں کل چودہ مضامین ہیں، نو مضامین تو خود اقبال کی نثر نگاری کا نمونہ ہیں، باقی پانچ ترجمہ شدہ ہیں۔ اس میں وہ تاریخی دیباچہ بھی شامل ہے، جو علامہ نے اسرار خودی کی پہلی اشاعت پر اردو میں لکھا تھا اور جو بعد میں نہ معلوم کیوں حذف کر دیا گیا۔ اس میں علامہ کا وہ مشہور مقالہ بھی ہے، جو انہوں نے اسلام کے نظام عمرانی کے متعلق تحریر فرمایا تھا اس کا ترجمہ بابائے صحافت مولانا ظفر علی خاں نے کیا ہے۔ مسلم لیگ کا مشہور تاریخی خطبۂ صدارت کا ترجمہ جناب سید نذیر نیازی صاحب کے قلم سے ہے اور پنڈت جواہر لال نہرو کے مضمون کے جواب میں علامہ اقبال نے ختم نبوت کے متعلق جو مقالہ انگریزی میں تحریر فرمایا تھا، اس کا ترجمہ جناب میر حسن الدین صاحب نے کیا ہے یہ علامہ

---

[1] اس مضمون کا عنوان ہے "کلام اقبال کا تحلیلی مطالعہ" اور یہ ماہنامہ پیغام حق لاہور) بابتہ مارچ ۱۹۴۲ء میں چھپا تھا۔

کے مضامین کا پہلا مجموعہ ہے اس کی اشاعت کا سہرا بھی حیدرآباد کے سر ہے۔

قیام پاکستان کے بعد جناب سید عبدالواحد صاحب معینی نے اس مجموعہ کے مضامین میں مزید کچھ مضامین کا اضافہ کرکے مقالات اقبال کے نام سے ایک دوسرا مجموعہ ۱۹۶۳ء میں شائع کیا۔

کلیاتِ اقبال

بانگ درا ابھی چھپی نہیں تھی "البتہ علامہ اقبال کا اردو کلام ہندوستان کے طول وعرض میں مختلف رسائل وجرائد میں چھپتا رہتا تھا دکن کے ایک صاحب ذوق عہدہ دار عبدالرزاق صاحب راشچن کو کلام اقبال سے شغف پیدا ہوگیا تھا، انہوں نے چھوٹے بڑے جرائد ورسائل سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر کلام اقبال کو نکالا اور جمع کیا اور "کلیات اقبال" کے نام سے (۳۹۶) صفحات کا ایک ضخیم مجموعہ بڑے اہتمام سے چھپوا کر شائع کیا۔ اور علامہ اقبال کو اس کا معاوضہ (رائلٹی) مبلغ ایک ہزار روپیہ پیش کیا۔ یہ ۱۹۲۳ء کی بات ہے ۱۹۲۴ء میں کلیات اقبال چھپ کر بازار میں آگئی فاضل مرتب نے اس کے صرف پانچ سو نسخہ چھپوائے تھے۔ جس میں سے انہوں نے دو سو تو بطور تحفہ وہدیہ اپنے دوست احباب کی نذر کئے، لیکن مطبع کے مالک نے مرتب کے علم واطلاع کے بغیر ایک ہزار نسخے الگ چھاپ ڈالے تھے ۱۹۲۴ء میں علامہ نے اپنا اردو کلام خود مرتب کرکے بانگ درا کے نام سے شائع کیا۔ بانگ درا کے ناشر سے علامہ کا حسب قاعدہ معاہدہ ہوتے وقت ایک الجھن یہ پیدا ہوئی کہ کلیات اقبال حیدرآباد سے باہر ہندوستان کے دوسرے گوشوں میں بھی پہنچنے لگی تھی۔ اور اس میں اکثر وبیشتر وہی نظمیں اور غزلیں تھیں جو بانگ درا میں شامل ہیں۔ ایسی صورت میں ناشرین

بانگ درا کو حاصل ہوا۔ ان حالات میں علامہ اقبال نے سر اکبر حیدری کو جو اس وقت وزیر مالیات تھے، خط لکھا کہ وہ عبدالرزاق صاحب کو اس بات پر رضامند کریں کہ کلیات اقبال کی اشاعت ریاست حیدرآباد سے باہر نہیں ہوگی۔ عبدالرزاق صاحب اس پر راضی ہو گئے۔ اس طرح "کلیات اقبال" اردو کا پہلا مجموعہ کلام ہے جو حیدرآباد سے شائع ہوا تھا اور اس سے اہل حیدرآباد کی قدر شناس نگاہ کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔

اس مجموعہ میں ایسی غزلیں اور نظمیں بھی ہیں جو اب نایاب ہیں۔ اور اس مجموعہ پر فاضل مرتب کا ایک مبسوط دیباچہ بڑی سائز کے ایک سو چھتیس صفحات پر پھیلا ہوا۔ کہنا چاہئے کہ کلام اقبال پر پہلا سیر حاصل تبصرہ ہے اس میں وقار الملک نے علامہ اقبال کے بارے میں خیالات اور سنہ ۱۹۱۱ء میں علامہ شبلی کے ہاتھوں اقبال کی گلپوشی اور اس قسم کی اور باتیں آگئی ہیں جو آج لوگوں کے لئے تاریخ کے نامعلوم اوراق بن چکی ہیں۔

نظم اقبال

یہ علامہ اقبال کے سنہ ۱۹۱۰ء کے سفر حیدرآباد کے تاثرات ہیں اس کتاب میں جو تصدق حسین صاحب تاج نے ۱۹۳۷ء میں شائع کی تھی، اقبال کی دو نظمیں، سر عبدالقادر اور خود علامہ اقبال کی نوشتہ تمہیدوں کے ساتھ شامل کر دی گئی ہیں۔ ایک نظم یمین السلطنت مہاراجہ سر کشن پرشاد شاد وزیر اعظم دولت آصفیہ کی کرم نوازیوں کے شکریہ میں کہی گئی تھی۔ اس کا عنوان علامہ نے "شکریہ" رکھا تھا، اس طویل نظم کے آخری دو شعر یہ ہیں ؎

نقش وہ اس کی عنایت نے مرے دل پر کیا
محو کر سکتا نہیں جس کو نسیم روزگار

شکریہ احسان کا اقبال لازم تھا مجھے
مدح پیرائی ایروں کی نہیں میرا شعار

اور دوسری نظم "گرستان شاہی" ہے جو معمولی تبدیلی کے بعد "بانگ درا" میں شامل کی گئی ہے۔

شاد اقبال

ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے اس عنوان سے علامہ اقبال اور مہاراجہ سرکشن پرشاد کی باہمی مکاتبت شائع فرمائی تھی۔ مکاتیب اقبال کے سلسلے میں اس پونے دو سو صفحے کی کتاب کو نہ صرف ادبیت حاصل ہے بلکہ یہ انفرادیت بھی کہ کاتب و مکتوب الیہ دونوں کے خطوط یکجا ہیں۔ کاش حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ کے جوابی مکتوبات کے ساتھ علامہ اقبال کے خطوط اسی طرح شائع ہوتے تو علم کا ایک ذخیرہ ہمارے ہاتھ آتا۔ ان اہم تالیفات کے بعد اب آیئے تراجم پر!

فلسفۂ عجم

یہ ترجمہ ہے علامہ اقبال کے مقالہ (Development of Metaphysics in Persia) علامہ اقبال کو اسی مقالہ پر میونخ یونیورسٹی سے پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری دی گئی تھی۔ اس کا ترجمہ میر حسن الدین صاحب نے علامہ اقبال سے اجازت لے کر فلسفۂ عجم کے عنوان سے کیا۔ میر صاحب نے جامعہ عثمانیہ سے فلسفہ میں بی۔اے کیا تھا۔ پھر ایل ایل بی کی ڈگری بھی لی تھی۔ وہ بلدہ حیدرآباد سے ایک ہفت روزہ سیاست بھی نکالا کرتے تھے۔ وہ ایک مشاق مترجم تھے چنانچہ ان کا یہ ترجمہ رواں دواں ہے اس کی اشاعت ۱۹۳۶ء میں ہوئی تھی۔

ترجمۂ خطبات

علامہ اقبال کے مشہور خطبات "Reconstuction of Religious Thought in Islam" کا ترجمہ بھی میر حسن الدین صاحب نے شروع کیا تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کام کو مکمل نہ کر سکے اس لئے یہ ترجمہ شائع نہیں ہوا البتہ ان ہی خطبات میں سے پہلے خطبہ کا ترجمہ علم اور مذہبی واردات کے عنوان سے پروفیسر غلام دستگیر رشید کے مرتبہ مجموعہ مضامین فکرِ اقبال میں شائع ہوا تھا۔ اور چھٹے خطبہ کا نامکمل ترجمہ اسلامی ہیئت اجتماعی میں اصول حرکت کے زیر عنوان پروفیسر دستگیر رشید کے مرتبہ ایک اور مجموعہ حکمتِ اقبال میں شائع ہوا تھا۔

ان دو تراجم کے بعد دو خصوصی نمبر بھی قابل ذکر ہیں

ماہنامہ اردو کا اقبال نمبر

یہ خصوصی نمبر لگ بھگ چار سو صفحات کی ضخامت کا تھا اور اس میں لکھنے والے چنیدہ اہل علم و قلم مثلاً ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر یوسف حسین خاں اور پروفیسر عبدالواحد وغیرہ ہیں لہٰذا معیار کی رفعت محتاج اظہار نہیں رہ جاتی۔ یہ خصوصی شمارہ اکتوبر ۱۹۳۸ء میں اورنگ آباد دکن سے جہاں بابائے اردو عبدالحق کی انجمن ترقی اردو کا دفتر تھا شائع ہوا تھا۔ مولوی عبدالحق صاحب کے سر اقبال پر خصوصی نمبر کی اشاعت کا سہرا ہے۔ گو اس میں خود ان کا کوئی مضمون نہیں، وجہ جو بھی ہو، !

ماہنامہ سب رس کا اقبال نمبر

انجمن ترقی اردو کی طرح ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے شہر حیدرآباد میں "ادارۂ ادبیات اردو" کی طرح ڈالی تھی اور بہت جلد یہ ادارہ ہندوستان بھر میں

شہرت پاگیا تھا، اس ادارہ کا ترجمان ماہنامہ "سب رس" تھا جس کے مدیر صاحبزادہ میکش اور خواجہ حمید الدین شاہد تھے، دونوں شاعر و انشاء پرداز، سب رس نے بھی اپنا خصوصی اقبال نمبر اسی ۱۹۳۸ء میں شائع کیا جس کی خصوصیات میں ایک نادر گروپ فوٹو جس میں اقبال، راس مسعود، غلام السیدین، راس باتھم، ڈاکٹر خالد شیلڈرک وغیرہ ہیں اور ان تمام جلسوں کی تفصیلات جو اس تاریخ تک حیدرآباد میں "یوم اقبال" کے سلسلے میں منائے گئے تھے اور مشاہیر ہند کے پیامات شامل ہیں۔

حیدرآباد کے اقبال سے شغف کی روداد ابھی ختم نہیں ہوئی، یہ بھی سنانا ہے کہ

مرقع اقبال

کے نام سے ۱۹۴۸ء میں چغتائی صاحب کی فن کاری کا یہ مرقع بھی پہلی بار "بزم اقبال" کی طرف سے شائع ہوا، جس میں علامہ اقبال کے بعض منتخب اشعار کو مصور کر کے پیش کیا گیا ہے، اس پر پیش لفظ صدر "بزم اقبال" نواب حسن یار جنگ بہادر کے قلم سے اور تعارف خواجہ محمد احمد صاحب ناظم محکمۂ آثار قدیمہ کے قلم سے ہے۔ اس مرقع کا ٹائیٹل چغتائی کی نظر افروز تصویر "شہزادہ اورنگ زیب" سے مزین ہے جس کے نیچے علامہ کا یہ اثر آفریں شعر درج ہے ؎

قدرت کے مقاصد کا عیار اسکے ارادے
دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان

مذکورہ صدر مطبوعات کے علاوہ بیسیوں گراں قدر مضامین ان اہل کمال کے قلم سے اور بھی نکلے اور مختلف ماہناموں میں شائع ہوئے جن کی تفصیل اگر مرتب

بھی کرنا چاہیں تو اس کی سہولت یہاں مہیا نہیں۔ اور ماہر اقبالیات میں پروفیسر عبدالقیوم خاں باقیؔ کے افادات قلمی تو مل ہی نہ سکے، حالانکہ باقیؔ صاحب۔ ان معدودے چند ہستیوں میں تھے جن کی رسائی اقبال کی فکر کے مأخذ رومی اور گوئٹے، نیٹشے، ہیگل وغیرہ تک تھی، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ انہوں نے گوئٹے کے مشہور ڈرامے "فاؤسٹ" کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا تھا جس کو دیکھ کر ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم جیسے نقاد فن نے بھی تحسین و آفرین کی تھی۔ پروفیسر باقیؔ مرحوم کی تحریریں بھی راقم نے دیکھی ہیں اور ان کے لکچرز سے مستفید بھی رہا ہے، ان کا ایک ایک اشارہ اہل فہم کے لئے ایک ایک مضمون کا عنوان ہوتا تھا۔ افسوس کہ ان کے اور ان جیسے اور اہل افادہ کے آثار قلمی اسوقت اپنی پہنچ سے باہر ہیں ورنہ اقبالی ادب میں عہد عثمانی کے حیدرآباد کا کارنامہ اور زیادہ تفصیل سے پیش ہو سکتا[1]، اب تو قارئین سے اقبال کے پیر رومی کی زبان میں صرف یہ عرض کرتا ہے کہ۔

ع ایں قدر گفتیم باقی فکر کن

---

[1] یہ جو کچھ ہو سکا اس میں بڑی مدد نظر حیدرآبادی مرحوم کی کتاب "اقبال اور حیدرآباد" سے ملی، ویسے یہ میری خوش بختی ہے کہ اس مضمون میں جن مصنفین کرام اور مولفین عظام کا ذکر آگیا ہے ان میں سے بجز جناب عبدالرزاق راشد، سید اشفاق حسین اور پروفیسر ابو ظفر عبدالواحد کے، سب ہی سے راقم الحروف کا شخصی ربط رہا ہے۔ یا آج بھی ہے، الحمدللہ والمنہ!

اعلیحضرت میر عثمان علی خان نظام سابع
آخری تاجدار مملکت آصفیہ

خطاب بہ تاجدار دکن

اے مقامت برتر از چرخِ بریں
از تو باقی سطوتِ دینِ مبیں

جلوۂ صدیق از سیمائے تو
حافظِ ما تیغِ جوشن خائے تو

از تو مارا صبح خنداں شامِ ہند
آستانت مرکزِ اسلامِ ہند

دوشِ ملت زندہ از امروزِ تو
تاب ایں برقِ کہن از سوزِ تو

بندگانستیم ما تو خواجہ
از پئے فردائے ما دیباچہ

گوہرم را شوخیش بے باک کرد
تا گریبانِ صدف را چاک کرد

پیشِ سلطاں ایں گہر آوردہ ام
قطرۂ خونِ جگر آوردہ ام

اقبال نے نظم تاجدار دکن کے ساتھ فارسی کی مثنوی "رموزِ بے خودی" کا ایک نسخہ بھی اعلیٰحضرت بندگان عالی میر عثمان علی خاں کی خدمت میں بطور ہدیہ ارسال کیا تھا یہ نظم اقبال کے مطبوعہ کلام میں نہیں ملتی۔

حیدرآباد دکن

طلوعِ سحر

ہو رہی ہے زیرِ دامانِ اُفق سے آشکار
صبح یعنی دخترِ دوشیزۂ لیل و نہار

پا چکا فرصت ورودِ فصلِ انجم سے سپہر
کشتِ خاور میں ہوا ہے آفتاب آئینہ کار

آسماں نے آمدِ خورشید کی پا کر خبر
محملِ پروازِ شب باندھا سرِ دوشِ غبار

شعلۂ خورشید گویا حاصلِ اس کھیتی کا ہے
بوئے تھے دہقانِ گردوں نے جو تاروں کے شرار

ہے رواں نجمِ سحر جیسے عبادت خانے سے
سب سے پیچھے جائے کوئی عابدِ شب زندہ دار

کیا سماں ہے جس طرح آہستہ آہستہ کوئی
کھینچتا ہو میان کی ظلمت سے تیغِ آبدار

مطلعِ خورشید میں مضمر ہے یوں مضمونِ صبح
جیسے خلوت گاہِ مینا میں شرابِ خوش گوار

ہے تہِ دامانِ باد اختلاط انگیز صبح
شورشِ ناقوس آوازِ اذاں سے ہم کنار

جاگے کوئل کی اذاں سے طائرانِ نغمہ سنج
ہے ترنم ریز قانونِ سحر کا تار تار

اگرچہ قدرت نے مجھے افسردہ دل پیدا کیا
آنکھ وہ بخشی کہ ہے نظارہ آشامِ بہار

کھینچ کر سونے گلستاں لے گیا ذوقِ نظر
عاشقِ فطرت کو ہے صحنِ گلستاں کوئے یار

گل نے بلبل سے کہا لے ہم صفیر آیا ترا
کہتی تھی بلبل کہ اے مقصودِ چشمِ انتظار

اتنے دن غائب رہا تو گلشنِ پنجاب سے
کر لیا تھا کیا کسی صیاد نے تجھ کو شکار

طلوعِ سحر کے پہلے نو اشعار "نمودِ صبح" کے عنوان سے بانگ درا میں شائع ہوئے ہیں باقی اشعار حذف کر دیئے گئے ہیں۔

کس سے کہتے رازِ اپنا لالہ ہائے شعلہ پوش — کس پہ کرتے دردِ دل اپنا عنادل آشکار
پوچھتی تھی روز مجھ سے نرگسِ شبنم فریب — ہو گیا غائب کہاں اپنے چمن کا رازدار
پھول فرقت میں تری سوزن بہ پیراہن رہے — دیدۂ قمری میں تھا صحنِ گلستاں خارزار
غنچۂ نوخیز کو یہہ کہہ کے بہلاتی تھی میں — ہے یہیں پوشیدہ وہ وارفتۂ فصلِ بہار
کچھ تو کہہ ہم سے بھی اس وارفتگی کا ماجرا — لے گیا تجھکو کہاں تیرا دلِ بے اختیار

کس تجلی گاہ نے کھینچا ترا دامانِ دل
تیری مشتِ خاک نے کس دیس میں پایا قرار

کیا کہوں اس بوستانِ غیرتِ فردوس کی — جس کے پھولوں میں ہوا اے ہم نوا میرا گزار
جس کے ذرّے مہرِ عالم تاب کو سامانِ نور — جس کی طور افروزیوں پہ دیدۂ موسیٰ نثار
خطۂ جنت فضا جس کی ہے دامن گیرِ دل — عظمتِ دیرینۂ ہندوستاں کی یادگار
جس نے اسمِ اعظمِ محبوب کی تاثیر سے — وسعتِ عالم میں پایا صورتِ گردوں وقار

نور کے ذروں سے قدرت نے بنائی یہ زمیں
آئنہ ٹپکے دکن کی خاک اگر پائے فشار

آستانے پر وزارت کے ہوا میرا گذر — بڑھ گیا جس سے مرا ملکِ سخن میں اعتبار
اس قدر حق نے بنایا اس کو عالی مرتبت — آسمانِ اس آستانے کی ہے اک موجِ غبار
کی وزیرِ شاہ نے وہ عزت افزائی مری — چرخ کے انجم مری رفعت پہ ہوتے تھے نثار
مسند آرائے وزارت راجۂ کیواں حشم — روشن ہے اس کی رائے روشن سے نگاہِ روزگار

اُس کی تقریروں سے رنگیں گلستانِ شاعری — اس کی تحریروں پہ نظمِ مملکت کا انحصار
لیلیٰ معنی کا محمل اُس کی نثرِ دل پذیر — نظم اُس کی شاہدِ رازِ ازل کی پردہ دار
اُس کے فیضِ پا کی منت خواہ کانِ لعل خیز — بحرِ گوہر آفریں دستِ کرم سے شرمسار

سلسلہ اُس کی مروت کا یونہیں لاانتہا — جس طرح ساحل سے عاری بحرِ ناپیدا کنار
دل ربا اُس کا تکلم خلق اُس کا عطرِ گل — غنچہ گل کے لئے موجِ نفس بادِ بہار
ہو خطا کاری کا ڈر ایسے مدبّر کو کہاں — جس کی ہر تدبیر کی تقدیر ہو آئینہ دار
ہے یہاں شانِ امارت پردہ دارِ شانِ فقر — خرقہ درویشی کا ہے زیرِ قبائے زرنگار
خاکساری جوہرِ آئینۂ عظمت بنی — دست وقفِ کارفرمائی و دل مصروفِ یار
نقش وہ اُس کی عنایت نے مرے دل پر کیا — محو کر سکتا نہیں جس کو مرورِ روزگار

شکریہ احساں کا لے **اقبال** لازم تھا مجھے
مدح پیرائی امیروں کی نہیں میرا شعار

نورِ بصیرت

جوانوں کو میری آہِ سحر دے
پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے
مرا نورِ بصیرت عام کر دے

علامہ اقبالؒ

گورستان شاہی

گورستانِ شاہی

آسماں بادل کا پہنے خرقۂ دیرینہ ہے — یعنی دھندلا سا جبینِ ماہ کا آئینہ ہے
چاندنی پھیکی ہے اس نظارۂ خاموش میں — صبح صادق سو رہی ہے رات کے آغوش میں
کس قدر اشجار کی حسرت فزا ہے خامشی — بربطِ قدرت کی دھیمی سی نوا ہے خامشی

فطرت نظارۂ امکاں سراپا درد ہے
اور خاموشی لبِ ہستی پہ آہِ سرد ہے

آہ جولاں گاہِ عالم گیر یعنی وہ حصار — دوش پر اپنے اٹھائے سیکڑوں صدیوں کا بار
زندگی سے تھا کبھی معمور اب سنسان ہے — یہ خموشی اس کی ہنگاموں کی گورستان ہے!

اپنے سکان کہن کی خاک کا دلدادہ ہے
کوہ کے سر پر مثالِ پاسباں استادہ ہے

ابر کے روزن سے وہ بالائے بامِ آسماں — ناظرِ عالم ہے بنجم سبز فامِ آسماں
خاک بازی وسعتِ دنیا کا ہے منظر اُسے — داستاں ناکامیٔ انساں کی ہے ازبر اُسے
ہے ازل سے یہ مسافر سوئے منزل جا رہا — آسماں سے انقلابوں کا تماشا دیکھتا
گو سکوں ممکن نہیں عالم میں اختر کے لئے — فاتحہ خوانی کو یہ ٹھہرا ہے دم بھر کے لئے

گرچہ باغِ زندگی سے گل بدامن ہے یہیں
سیکڑوں خوں گشتہ تہذیبوں کا مدفن ہے یہیں

خوابگہ شاہوں کی ہے یہ منزلِ حسرت فزا — دیدۂ عبرت خراجِ اشکِ گلگوں کر ادا

ہے تو گورستاں مگر یہ خاک گردوں پایہ ہے — آہ اک برگشتہ قسمت قوم کا سرمایہ ہے
مقبروں کی شان حیرت آفریں ہے اس قدر — جنبش مژگاں سے ہے چشم تماشا کو حذر
کہہ رہی ہے کوئی ایام کہن کی داستاں — چاندنی کرتی ہے میناروں سے کیا سرگوشیاں

کیفیت ایسی ہے ناکامی کی اس تصویر میں
جو اتر سکتی نہیں آئینہ تحریر میں

سوتے ہیں خاموش آبادی کے ہنگاموں سے دور — مضطرب رکھتی تھی جن کو آرزوئے ناصبور
قبر کی ظلمت میں ہے ان آفتابوں کی چمک — جن کے دروازہ پہ رہتا تھا جبیں گستر فلک
کیا یہی ہے ان شہنشاہوں کی عظمت کا مآل — جن کی تدبیر جہاں بانی سے ڈرتا تھا زوال
رعب فغفوری ہو دنیا میں کہ شان قیصری — ٹل نہیں سکتی غنیم موت کی یورش کبھی

بادشاہوں کی بھی کشت عمر کا حاصل ہے گور
جادۂ عظمت کی گویا آخری منزل ہے گور

شورش بزم طرب کیا عود کی تقریر کیا — قیدئ زندان غم کا نالۂ شب گیر کیا
عرصہ پیکار میں ہنگامہ شمشیر کیا — خون کو گرمانے والا نعرۂ تکبیر کیا

اب کوئی آواز سوتوں کو جگا سکتی نہیں
سینۂ ویراں میں جان رفتہ آ سکتی نہیں

روح مشت خاک میں زحمت کش بیداد ہے — کوچہ گردے ہوا جس دم نفس فریاد ہے
زندگی انساں کی ہے مانند مرغ خوش نوا — شاخ پر بیٹھا کوئی دم چہچہایا۔ اڑ گیا

آہ کیا آئے ریاضِ دہر میں ہم کیا گئے　　زندگی کی شاخ سے پھوٹے کھلے مرجھا گئے
موت ہر شاہ و گدا کی خواب کی تعبیر ہے
اس ستم گر کا ستم انصاف کی تصویر ہے

سلسلہ ہستی کا ہے اک بحر ناپیدا کنار　　اور اس دریائے بے پایاں کی موجیں ہیں مزار
اے ہوس خوں رو کہ ہے یہ زندگی بے اعتبار　　یہ شرارے کا تبسم یہ خس آتش سوار
یہ قمر جو ناظم عالم کا اک اعجاز ہے　　پہنے سونے کی قبا محو خرام ناز ہے
چرخ بے انجم کی دہشت ناک وسعت میں مگر　　بے کسی اس کی کوئی دیکھے ذرا وقت سحر
اک ذرا سا ابر کا ٹکڑا ہے جو مہتاب تھا
آخری آنسو ٹپک جانے میں ہے جس کی فنا

زندگی اقوام کی بھی ہے یونہیں بے اعتبار　　رنگ ہائے رفتہ کی تصویر ہے ان کی بہار
اس زیاں خانے میں کوئی ملتِ گردوں وقار　　رہ نہیں سکتی ابد تک بار دوشِ روزگار
اس قدر قوموں کی بربادی سے ہے خوگر جہاں　　دیکھتا بے اعتنائی سے ہے یہ منظر جہاں
ایک صورت پر نہیں رہتا کسی شے کو قرار　　ذوقِ جدت سے ہے ترکیبِ مزاجِ روزگار
ہے نگینِ دہر کی زینت ہمیشہ نام نو
مادرِ گیتی رہی آبستن اقوام نو

ہے ہزاروں قافلے سے آشنا یہ رہ گزر　　چشم کوہ نور نے دیکھے ہیں کتنے تاجور
مصر و بابل مٹ گئے باقی نشاں تک بھی نہیں　　دفتر ہستی میں ان کی داستاں تک بھی نہیں

آدبایا مہر ایراں کو اجل کی شام نے   عظمت یونان و روما لوٹ لی ایام نے

آہ مسلم بھی زمانے سے یونہیں رخصت ہوا
آسماں سے ابر آزاری اٹھا برسا گیا

× صبح کے تارے پہ بھی مشرق کے رہزن کی نظر   وہ اڑا کر لے گیا آویزۂ گوش سحر
× شب کے اختر دیدۂ خورشید سے ڈرتے ہیں یہ   بھیس شبنم کا بدل کر سیر گل کرتے ہیں یہ
ہے رگ گل صبح کے اشکوں سے موتی کی لڑی   کوئی سورج کی کرن شبنم میں ہے الجھی ہوئی
سینۂ دریا شعاعوں کے لئے گہوارہ ہے   کس قدر پیارا لب جو مہر کا نظارہ ہے
× رات یہ تاروں بھری ذوق نظر کی عید ہے   ریزہ ریزہ ٹوٹ کر پیمانۂ خورشید ہے
× اگتے ہیں شاخ چمن سے شعلۂ بے سوز گل   روح کا فردوس ہے حسن نظر افروز گل
محو زینت ہے صنوبر جویبار آئینہ ہے   غنچۂ گل کے لئے باد بہار آئینہ ہے
نعرہ زن رہتی ہے بلبل باغ کے کاشانہ میں   چشم انساں سے نہاں پتوں کے عزلت خانہ میں
اور بلبل مطرب رنگیں نوائے گلستاں   جس کے دم سے زندہ ہے گویا ہوائے گلستاں

عشق کے ہنگاموں کی اڑتی ہوئی تصویر ہے
خامۂ قدرت کی کیسی شوخ یہ تحریر ہے

باغ میں خاموش جلسے گلستاں زادوں کے ہیں   وادی و کہسار میں نعرے شباں زادوں کے ہیں
زندگی کی مے سے مینائے جہاں لبریز ہے   منظر حسرت بھی ہے کوئی تو حسن آمیز ہے

پتیاں پھولوں کی گرتی ہیں خزاں میں اس طرح — دستِ طفلِ خفتہ سے رنگیں کھلونے جس طرح
اس نشاط آباد میں گو عیش بے اندازہ ہے
ایک غم یعنی غمِ ملت ہمیشہ تازہ ہے

دل ہمارے یادِ عہدِ رفتہ سے خالی نہیں — اپنے شاہوں کو یہ امت بھولنے والی نہیں
اشک باری کے بہانے ہیں یہ اُجڑے بام و در — گریۂ پیہم سے بینا ہے ہماری چشمِ تر
دہر کو دیتے ہیں موتی دیدۂ گریاں کے ہم — آخری بادل ہیں اک گزرے ہوئے طوفاں کے ہم
ہیں ابھی صدہا گہر اس ابر کی آغوش میں — برق ابھی باقی ہے اس کے سینۂ خاموش میں
وادیِ گل خاکِ صحرا کو بنا سکتا ہے یہ — خواب سے اُمیدِ دہقاں کو جگا سکتا ہے یہ
✗ خندۂ طفلک سے ہے اس کی چمک محبوب تر — چھو نہیں سکتی اسے صرصر کی موجِ پرخطر
ہو چکا گو قوم کی شانِ جلالی کا ظہور
ہے مگر باقی ابھی شانِ جمالی کا ظہور

سہ نظم گورستانِ شاہی کا شعر ۴۴، ۴۵، ۴۸، ۴۹ اور ۶۳ بانگِ درا میں حذف کر دیئے گئے ہیں۔

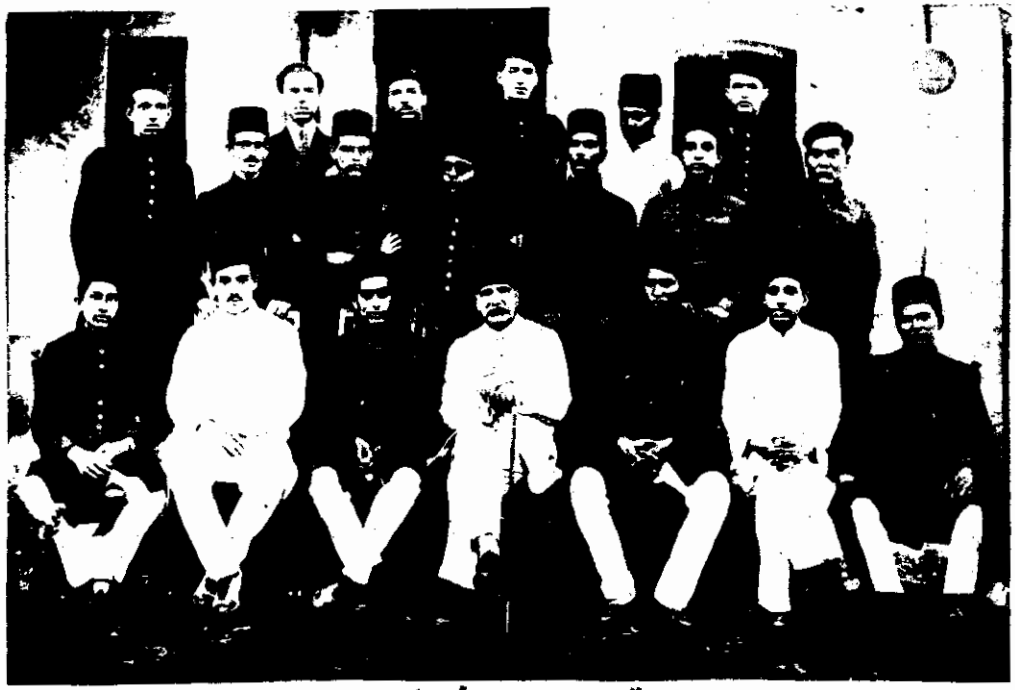

علامہ اقبال طلبا جامعہ عثمانیہ کے ساتھ

اُمت کا شب چراغ

جس رہ نوردِ شوق کو منزل سے عار تھا
جس موجِ بے قرار کو ساحل سے عار تھا

کس کی نظر نے اس کو نظر بند کر دیا
اس برقِ جاں نواز کو پابند کر دیا

شعلہ زمیں کا عرش کی گودی میں سو گیا
اُمت کا شب چراغ اُجالے میں کھو گیا

(مخدوم محی الدین)

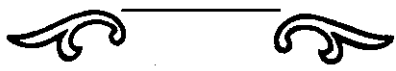

حضرتِ اقبالؒ

ہر طرف سے آ رہی ہے آہ و زاری کی صدا　　آسمانِ علم و فن پر غم کا بادل چھا گیا
چار سو اندھیر ہے مہرِ مبیں گہنا گیا　　غم گسارِ قوم کو خود قوم کا غم کھا گیا

آ گئی فصلِ خزاں، سارا چمن پامال ہے
سر زمینِ ہند، بزمِ ماتمِ اقبال ہے

اے دیارِ علم و حکمت خطۂ ہندوستان　　خاک سے اُٹھے ہیں تیری کتنے ایسے نکتہ داں
بخش دی اقبال نے تجھ کو حیاتِ جاوداں　　جانتا ہے اُس کی نسبت سے تجھے سارا جہاں

آج شمعِ بزم گو آسودہ زیرِ خاک ہے
اس کے اشکوں سے مگر خاکِ وطن نمناک ہے

قوم کو جس نے دیئے لبریز جامِ زندگی　　ہو گئے سیراب لاکھوں تشنہ کامِ زندگی
جوش نے جس کے بدل ڈالا نظامِ زندگی　　غرق کر دی صبح کے جلووں میں شامِ زندگی

کشتیٔ دل کو سدا سیلاب پر کھیتا رہا
سست رفتاروں کو پیغامِ عمل دیتا رہا!

قوم کی کایا پلٹ دی شعر کے اعجاز سے　　ہو گئے کمزور واقف لذتِ پرواز سے
صدق کے دریا بہا ڈالے جنوں کے ساز سے　　خرمنِ باطل جلایا شعلۂ آواز سے

داغِ محکومی کو آبِ اشک سے دھوتا رہا
ملک و ملت کی تباہی پر سدا روتا رہا

بے سہارا ہو گئے ہیں آج دست و پائے قوم　　ہو گیا بے نور آخر دیدۂ بینائے قوم

بیوگی کاہے مرقع چہرۂ زیبائے قوم — پرنو امروز سے تاریک ہے فردائے قوم

شمع کے بجھتے ہی ساری رونقِ محفل گئی

حشر برپا ہے بنائے ملک وملت ہل گئی

خون بہا آنکھوں سے تو بھی آج اے اردو زباں — اب حقیقت ہے ترے اقبال کی اک داستاں

موت کے قزاق نے لوٹی تری جنس گراں — اور منزل سے ابھی ہے دور تیرا کارواں

تیرے جوہر دہر میں چمکانے والا مر گیا

حیف بدقسمت! ترا غم کھانے والا مر گیا

دور کی جس نے دلوں سے گرد وہم کدری — روکا کیا جس کی کرامت نے طلسم سامری

بے حقیقت ہو گئی الفاظ کی جادوگری — بن گیا آئینۂ جذبات فن شاعری

موت کی وادی میں بادِ زندگی چلنے لگی

یاس کی محفل میں پھر شمعِ یقیں جلنے لگی

اب تری مظلوم حالت پر ترس کھائے گا کون — تیرے دامانِ تہی میں پھول برسائے گا کون

حسن کو تیرے اُجاگر کر کے دکھلائے گا کون — بوقلمونی تیری زمانے بھر سے منوائے گا کون

کوچ دنیا سے ہوا اس مردِ جوہر دار کا

جس نے بخشا تجھ کو دلکش بانکپن تلوار کا

ہمنشیں قلبِ حزیں پر داغ کھاؤں کس لئے — دید کی حسرت کا افسانہ سناؤں کس لئے

سامنے اغیار کے آنسو بہاؤں کس لئے — کیا دھرا ہے اب وہاں لاہو جاؤں کس لئے

قافلہ ہے بھی تو کیا، وہ زینت محفل نہیں

اب کسی کو دیکھنے کی آرزو دل میں نہیں

تو نے اے اقبال! پائی عاشق شیدا کی موت — جاں نثار و غمگسارِ ملتِ بیضا کی موت
موت ہے تیری زبان و قوم کے آقا کی موت — سوز و ساز و درد و داغ و عشقِ بے پروا کی موت

کون اب عقل و جنوں کی گتھیاں سلجھائے گا
کون سوزِ دل سے جان و روح کو گرمائے گا

فرقِ باطل کے لئے تو تیغِ بے زنہار تھا — مردِ کامل۔ صاحبِ دل واقفِ اسرار تھا
تا دمِ آخر مئے توحید سے سرشار تھا — بہرِ حق سارے جہاں سے برسرِ پیکار تھا

تھے ترے سب کام مولیٰ کی رضا کے واسطے
دوستی اور دشمنی، دونوں خدا کے واسطے

تیری آنکھوں میں بسا تھا روئے احمد کا جمال — ہیچ تھا تیری نظر میں بادشاہوں کا جلال
تیری شمشیرِ زباں تھی قاطعِ دستِ سوال — تیرا مسلک فقرِ حیدرؓ، عشقِ سلمانؓ و بلالؓ

شمعِ ایماں سے زمانے میں اُجالا کر دیا
عشق کا تو نے جہاں میں بول بالا کر دیا

نعمتِ دیدار سے عاشق کا جی بھرتا نہیں — جان دینے میں وہ ہرگز پیش و پس کرتا نہیں
ڈرتے ہیں بے دین، مومن موت سے ڈرتا نہیں — زندۂ جاوید رہتا ہے، کبھی مرتا نہیں

مرتے مرتے فاش کر جاتا ہے رازِ زندگی
موت کے دامن پہ پڑھتا ہے نمازِ زندگی

موسمِ گل تیری تربت پر گل افشانی کرے — روح پر تیری زمانہ فاتحہ خوانی کرے
بارشِ الطاف کی خالق فراوانی کرے — قبر پر تیری اُجالا، شمعِ ایمانی کرے

تا قیامت تجھ پہ ابرِ فضلِ گل روتا رہے!
تو یوں ہی آغوشِ رحمت میں سدا سوتا رہے!

سکندر علی وجد

شاعرِ مشرق

آسمانوں سے گزر جاتی تھی جس کی جستجو! بندگی میں جس نے کی تھی اپنے رب سے گفتگو
عرشیوں کا دل ہلا دیتا تھا جس کا اضطراب ذاتِ باری نے دیا تھا جس کے شکوہ کا جواب
جس کی آہوں کے شرارے دل کو گرماتے رہے جس کے آنسو، کوثر و تسنیم چھلکاتے رہے
جس کی الجھن تھی مسلمانوں کے لئے وجہِ سکوں تھا خرد آموزِ مشرق جس کا اندازِ جنوں
بیخودی میں جس کی احساسِ خودی کا راز تھا سوز کے پردے میں جس کا ہر نفس اک ساز تھا
کس لئے روتا ہے؟ اسکی موت پر اے کم نظر! موت اک موہوم پردہ ہے ثباتِ زیست پر
مردِ مومن مسکراتا ہے اجل کو دیکھ کر قید و بندِ زندگی کے ماحصل کو دیکھ کر
ڈھونڈتا ہے بحر میں ساحل سفینے کے لئے زندۂ جاوید مرتا بھی ہے جینے کے لئے
تن ہوا ٹھنڈا تو کیا؟ ہے روح گرمائی ہوئی موت کے پردہ میں بھی ہے زندگی آئی ہوئی
چیر کر سینے کو داغِ دل دکھانے کے لئے عرش پر روٹھے ہوئے رب کو منانے کے لئے
خلد کو اپنے ترانوں سے سجانے کے لئے اڑ گئی بلبل قفس سے آشیانے کے لئے

محرمِ منزل تھا، رستے میں ٹھہر سکتا نہیں
کہہ رہی ہے زندگی اقبال مر سکتا نہیں

صاحبزادہ میکش

آہ اِقبال

مل گیا خاک میں اب علم و عمل کا رہبر
اُٹھ گیا دہر سے اِسلام کا بیدار نظر

اس کی آواز میں اک درد بھرا رہتا تھا
زخمِ دل اُس کی صداؤں سے ہرا رہتا تھا

آج قدرت کے ارادوں کا مفکر نہ رہا
جسکی مٹھی میں دل و جاں تھے وہ ساحر نہ رہا

اب نظر آئے گا ہم کو نہ جمالِ نغمہ
مٹ گیا عالمِ فانی سے کمالِ نغمہ

چشمِ انجم کے اشارے کوئی دیکھے تو سہی
حسنِ مطلق کے شرارے کوئی دیکھے تو سہی

آسماں شوخئ بے باک سے محروم ہوا
اور جہاں نغمۂ افلاک سے محروم ہوا

اس کے افکار میں گہرائی سموات کی تھی
اس کی آہوں میں چمک، تلخئ آفات کی تھی

شعر سے تازگئ قطرۂ شبنم پیدا
اس کی ٹھنڈک سے تصور میں تھا اک نم پیدا

محفل علم میں اب شعر کا اعجاز کہاں
نغمۂ انجمِ تاباں کا نوا ساز کہاں

آہ اسلام کی دولت کے لٹانے والے
آخرت میں نئی راہ دکھلانے والے

آہ وہ شمع جو عشق کی محفل میں نہیں
آہ وہ موج کہ جو حسن کے ساحل میں نہیں

جس [illegible] ادرعجم پر تو عیاں ہوتا تھا
تجھ پہ اک برقِ تجلی کا گماں ہوتا تھا

میں تجھے خاک کی آغوش میں پاتا ہی نہیں
میں تجھے تنگ فضاؤں میں گنواتا ہی نہیں

تو ہے اک وسعتِ جاوید میں سرگرمِ سفر
جو شب و روز تری فکر کی تھی پیشِ نظر

انجم و خاور و مہتاب ہے منزل [illegible]ری
روحِ عالی ہے فرشتوں کے مقابل تیری

تیغ فاروقؓ کے انوار دکھانے والے
فقر حیدرؓ کو دل و جاں میں بسانے والے

پیرِ رومیؒ تجھے دامن میں چھپا لیتے ہیں
عرش والے تجھے سینے سے لگا لیتے ہیں

(عبدالقیوم باقی)

خوابِ اقبال

بے اختیاریوں کا بہانہ بدل گیا
وہ لَے بدل گئی وہ ترانہ بدل گیا
تازہ حقیقتوں سے فسانہ بدل گیا
فکر و عمل کے ساتھ زمانہ بدل گیا
موجِ نشاط آئی، کلی دل کی کھِل گئی
تعبیرِ خوابِ حضرتِ اقبال مل گئی

(نظر حیدرآبادی)

منشورِ پاکستان

قائدِ ملت نواب بہادر یار جنگ کی یہ وہ معرکتہ الآرا تقریر ہے جو آل انڈیا مسلم لیگ کے مشہور اجلاس کراچی میں فرمائی گئی تقریر میں پاکستان کا پس منظر و پیش منظر، تحریکِ پاکستان، اُس کے اغراض و مقاصد پر شرح وبسط سے روشنی ڈالی گئی ہے اور واضح الفاظ میں بتایا گیا ہے کہ پاکستان کا دستور قرآنی اور صرف قرآنی ہوگا۔

آج کل کے حالات میں جب ہمارا ملک سیاسی بحران کا شکار ہو رہا ہے اس کا مطالعہ نہ صرف نشانِ راہ ہے۔ بلکہ منزل کا تعین اور ہمارے دَرد کا مداوا ہے

تقریر سے پہلے جناب محمد احمد خاں کا سیر حاصل پیش لفظ ہے جس میں تفصیل سے تقریر کی افادیت کا احاطہ کیا گیا ہے۔

قیمت ڈھائی روپے

ملنے کا پتہ

بہادر یار جنگ اکادمی۔ کراچی ۵

تاثراتِ دکن

"تاثرات دکن" برصغیر کے مشہور و معروف صاحب قلم حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی کا سفرنامہ ہے۔ مرحوم نے تفصیل سے حیدرآباد دکن کے جغرافیائی اور تاریخی پس منظر میں مملکت اسلامیہ آصفیہ کی تمدنی، تہذیبی، تعلیمی اور مذہبی خدمات کی روئیداد تحریر کی ہے۔ یہ روئیداد کیا ہے؟ اس میں حیدرآباد دکن مرحوم و مغفور (سابق مملکت اسلامیہ آصفیہ) کی تہذیب و ثقافت کی نظر افروز جھلکیاں ہیں، علمی ادبی اور مذہبی خدمات کا بیان ہے، شاہان آصفیہ کی رواداری اور اخوت کی داستان ہے، قائد ملت بہادر یار جنگ اور دکن کے بیشتر مرحوم مشاہیر اور زندہ علمی و ادبی شخصیتوں کی دلکش قلمی تصاویر ہیں اور حیدرآباد کے دینی، اسلامی، علمی اور ادبی اداروں کا دلچسپ تذکرہ ہے۔

مولانا کی یہ روئیداد تصور کے پردۂ سیمیں پر گویا حیدرآباد کی چلتی پھرتی حسین و رنگین فلم ہے۔

کتاب ہذا پر پاکستان کے مشہور اہل قلم جناب محمد احمد خاں صاحب نے پیش لفظ لکھا ہے اور حواشی تحریر فرمائے ہیں۔

اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خاں آخری تاجدار دکن، قائد ملت نواب بہادر یار جنگ آصفیہ کتب خانہ، عثمانیہ یونیورسٹی کی تصاویر سے مزین اس کتاب کی قیمت صرف پانچ روپے ہے۔

ملنے کا پتہ:۔ بہادر یار جنگ اکادمی۔ کراچی ۵

مطبوعات
بہادر یار جنگ اکادمی

۱۔ مملکت آصفیہ حیدر آباد دکن حصّہ اوّل ــــــ
(حیدر آباد دکن سے شائع ہونے والی کتابوں کی تفصیل) ۳۰ــ۰۰

۲۔ مکاتیب بہادر یار جنگ ــــــ
(نواب بہادر یار جنگ کے خطوں کا مجموعہ) ۲۰ــ۰۰

۳۔ نواب بہادر یار جنگ مشاہیر کی نظر میں ــــــ
(نواب صاحب سے متعلق برصغیر کے مشاہیر و مقتدر حضرات کے مضامین) ۲۰ــ۰۰

۴۔ حیات بہادر یار جنگ ــــــ
از حضرت مولانا غلام محمدؒ ۱۵ــ۰۰

۵۔ منشور پاکستان ــــــ
از قائد ملّت نواب بہادر یار جنگ ۲ــ۰۰

۶۔ تاثرات دکن ــــــ
از مولانا عبدالماجد دریابادی ۵ــ۰۰

۷۔ ارمغان دکن ــــــ
علّامہ اقبال سے متعلق مضامین واشعار کا مجموعہ ۵ــ۰۰

ملنے کا پتہ :۔
بہادر یار جنگ اکادمی۔ کراچی